بھاری بھرکم اور بلند پایہ شخصیت کے شایان شان نہیں کہا جاسکتا ہے بعض حوالے بھی غیر معیاری و غیر مستند کتابوں کے دیے گئے ہیں، مولانا کے تلامذہ کے تذکرہ میں بعض خلاف واقعہ باتیں درج ہوگئی ہیں، ان کی تصنیفات کے تعارف میں زیر بحث مسئلہ کے متعلق کہیں کہیں مولانا کی رائے کا پتہ نہیں چلتا، اسی طرح مقالہ نگار نے جن کتابوں کے قلمی نسخے دیکھے ہیں ان کے بارہ میں یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ، امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کو ائمہ ثلاثہ کہنا درست نہیں ہے، اس کا اطلاق امام صاحبؒ کے علاوہ تینوں مستقل صاحب مذہب ائمہ پر ہوتا ہے، یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ کو ائمہ ثلاثہ کہا جاتا ہے، اس موضوع پر مصنف کو ابھی اپنی محنت و کاوش جاری رکھنی چاہئے، تاکہ دوسرا اڈیشن زیادہ مستند اور محقق صورت میں چھپ سکے اور وہ موضوع کے شایان شان بھی ہو۔

متاع فکر:- از جناب عروج زیدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۰ روپیے پتے (۱) عرفان زیدی محلہ کٹ کوئیاں شہر رامپور (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد دہلی، (۳) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۴) نظامی بک ایجنسی، محلہ سوتھ بدایوں۔

جناب عروج زیدی کے کلام کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں، اب انھوں نے اپنی تازہ "متاع فکر" کو صحتمند جذبہ و خیال کے حامل اصحاب ذوق کی نذر کیا ہے، وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے شور و ہنگامہ سے کان بند کرکے شاعری کی قدیم پاکیزہ روایتوں اور اخلاقی و تہذیبی قدروں کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں، انھوں نے غزل کو اپنا موضوع فن بنایا ہے، ان کے تغزل میں صداقت پر مبنی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، اور ان کا خیال اور طریقہ بیان ابتذال اور عدم توازن سے خالی ہے، قدیم و جدید کے امتزاج سے انھوں نے اپنے اسلوب کو تازگی عطا کی ہے، ان کے نزدیک حسن خیال اور حسن بیان کے بغیر حسن کلام تشنۂ تکمیل رہتا ہے، ان کی غزلوں کی کیف آفرینی و دلکشی کا راز فکر و فن کی آرایش میں پنہاں ہے، مسائل حسن و عشق کی طرح ان کی غزلوں میں نئے دور کی تصویر بھی نظر آتی ہے، ان میں آدمی کی عظمت کا تصور اور خودداری و عزم و حوصلہ کی تلقین ملتی ہے، انھیں اسکا دکھ ہے کہ انسان نے اپنی عظمت و حیثیت کو بھلا دیا ہے، وہ خودشناس اور حق نوا نہیں رہا، اور اخلاقی و تہذیبی قدروں سے دامن کش ہوگیا ہے، درد و غم کے لذت شناس کم ہوگئے ہیں، ظاہر و باطن میں تضاد و منافقت اور دورخا پن عام ہے، موجودہ بہار میں خزاں کا منظر دکھائی دیتا ہے، عشق و محبت کے لطیف اور بلند جذبات پر ہوا و ہوس اور جنون و مستی پر مصلحت اندیشی غالب ہوگئی ہے، عروج صاحب کا کلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے

جلد ۱۳۸ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرمایہ کی کمی اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کی کارکردگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم جب سے اس کے جنرل سکریٹری ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے کو اس کا بہت ہی فعال، متحرک، ہوشمند اور لایق عہدیدار ثابت کر دکھایا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کو پاکستان منتقل کیا، تو اس لٹے پٹے ادارہ کو پہلے قاضی عبدالغفار اور پھر پروفیسر آل احمد سرور نے سنبھالا، اس زمانہ میں اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا، تو اس کے لائحۂ عمل سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جا رہی تھی، مگر یہ سخت جان بن کر اچھی طرح چلتی رہی، اور جب ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے بہی خواہوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس کی شاندار روایات کو کس حد تک برقرار رکھ سکیں گے، مگر اس عہدہ پر فائز ہوتے ہی ان کی دبی صلاحیتیں اچھی طرح ابھریں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ قلب دہلی میں اردو گھر کی تعمیر ہے، جب سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا یہ بے گھر تھا، جس بے سروسامانی اور ہمت شکن فضا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی تعمیر شروع کی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ان کے یقینِ محکم اور سعیِ پیہم کی بدولت دہلی کے سینہ راؤز ایونیو میں اردو گھر کی کئی منزلوں کی تعمیر کیا ہوئی کہ اس پر شیفتہ، میر، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ اور ناصر نذیر فراق کی اردو، بلکہ اس ملک کے کروروں باشندوں کی مادری زبان کا پرچم لہراتا نظر آیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم ہر کام کو خوش سلیقگی، ارادے کی پختگی اور ہمت کی بلندی سے انجام دینے کے عادی ہیں، آج کل کے ہنگامہ خیز دور میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا

جانتا ہے، ڈاکٹر خلیق انجم اس وصف سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انجمن ترقی اردو کو اپنی عملی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنا رکھا ہے، اسی کے ساتھ اپنی خوش ذوقی اور اپنی مجلس انتظامیہ کے حسنِ تعاون سے اس کو علم، فن، شعر اور ادب کا چمنستان بھی بنا دیا ہے۔

انجمن کے پرانے علمی سرمایہ کو چھوڑ کر اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن سے اردو زبان و ادب میں مفید اور قیمتی اضافے ہوئے ہیں، یہاں بعض ایسی کتابیں بھی شایع ہوئی ہیں جن کو لوگ بھول چکے تھے، اس کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں لیکن اس کے موجودہ جنرل سکریٹری کی جواں ہمتی اور بلند حوصلگی سے یہاں سے برابر کتابیں شایع ہو رہی ہیں، انگریزی میں آکسفورڈ ڈکشنری کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق کی نگرانی میں کیا گیا تھا، اب بازار میں بڑی مشکل سے ملتا تھا، لیکن ایک کثیر سرمایہ صرف کر کے اس کی طباعت انجمن کی طرف سے ہو گئی ہے، اسی طرح ایک مستند اردو ہندی ڈکشنری شایع کر کے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی مفید خدمت انجام دی گئی ہے، ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ ہفت روزہ اخبار 'ہماری زبان' اور سہ ماہی 'اردو ادب' اپنی پرانی روایات کے ساتھ برابر شایع ہو رہے ہیں۔

دار المصنفین کو اس ادارہ سے دیرینہ لگاؤ رہا ہے، کیونکہ اس کے ابتدائی دور کے روح رواں مولانا شبلی نعمانیؒ تھے، پھر یہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں وابستہ رہے، اس وقت یہ سطریں لکھنے میں انشراحی کیفیت اس لیے بھی پیدا ہو رہی ہے کہ اس کی طرف سے ابھی حال ہی میں حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ایک دیدہ زیب اور نظر فریب کتاب شایع ہوئی ہے، مارچ ۱۹۸۵ء میں انجمن کی نگرانی میں ایک باوقار سمینار ہوا تھا جس میں اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے تھے، ان ہی کا ایک مجموعہ شایع کر کے اردو میں ایک اہم اور مفید کتاب کا اضافہ کیا گیا ہے،

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کے مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی سے ہو جائے گا، جو یہ ہیں: خطبۂ افتتاحیہ از جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ، ایک جامع صفات شخصیت، از مالک رام، سید صاحبؒ کا سوانحی خاکہ از خلیق انجم، علامہ سید سلیمان ندویؒ بہ حیثیت ادیب، از پروفیسر عبدالمغنی،

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خیام پر ایک نظر، از سید صباح الدین عبدالرحمن، نقوش سلیمانی از رشید حسن خان، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور فارسی ادبیات از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایک اہم خطبہ پر اظہار خیال از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، سید صاحبؒ کا نظریۂ علم از پروفیسر مشیر الحق، دبستان شبلی کے ایک ممتاز ادیب از ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی، سید سلیمان ندویؒ کا تصور نبوت، از پروفیسر عنوان چشتی، آزادی سے قبل ہندوستان میں فرقہ پرستی کا مسئلہ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نقطۂ نظر، از انوار عالم، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ندوہ، از سید شہاب الدین دسنوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ از ابوالبقار ندوی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی میں اردو زبان میں مستعمل الفاظ کی تحقیق، از مولوی عبیداللہ کوٹی ندوی، سید سلیمان ندویؒ کی تنقید نگاری، از ڈاکٹر شارب ردولوی، مکاتیب سلیمان ایک جائزہ، از عبداللطیف اعظمی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کوچۂ شاعری میں از رفعت سروش، سید سلیمان ندویؒ اور اردو ادب از ارتضی کریم۔

ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں معروضیت کا چراغ گل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے حضرت سید صاحبؒ کی رنگارنگ عظمت کا اعتراف کر کے ان کو اپنی اپنی عقیدت کی گل پوشی کی ہے، بعض مضامین میں ہلکی پھلکی تنقیدیں ضرور ہیں، لیکن یہ شاید سمینار کی محفل میں کچھ گرمی پیدا کرنے کی خاطر قلمبند کی گئی ہیں، یا جس طرح غزل گوئی میں بادہ و ساغر کہے بغیر کوئی بات نہیں بنتی، اسی طرح آج کے مقالہ نگار کچھ اپنے ذہنی تفنن اور کچھ اپنے قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر تنقید نگاری کا گلگشت مستانہ ضروری سمجھتے ہیں، ایسی تنقید نگاری کی حیثیت تفریحی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت پر ہم دارالمصنفین کی طرف سے انجمن ترقی اردو اور اس کے صدر جناب مالک رام اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقالات

قرآن مجید اور مستشرقین

از
ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتونیہ ٹیونس یونیورسٹی ٹیونس
ترجمہ:- عبیداللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۴)

اختلاف قراءت کی بحث

مستشرقین نے قرآن مجید کی مختلف قراءتوں کو بھی نقد و تبصرہ کا موضوع بنایا ہے، چنانچہ گولڈزیہر لکھتا ہے کہ

" دنیا کی تمام قدیم مذہبی کتابیں جن کو ان کے ماننے والے منزل من اللہ اور وحی آسمانی سمجھتے ہیں، ان میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے، جس میں متن کے اسقدر اختلافات اور صحیح متن کے متعین کرنے میں اس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔[1]

گولڈزیہر کے مذکورہ بالا تبصرہ پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں، گذشتہ آسمانی مذاہب کی کتابوں کے اصل ابتدائی متون، کیا گولڈزیہر کی نظر سے گزرے ہیں؟ کیونکہ اس کے بعد ہی قرآن مجید اور گذشتہ کتب سماوی کے متون کے درمیان موازنہ کیا جاسکتا ہے، خود گولڈزیہر ہی یہ لکھتا ہے کہ

" تلمود کا بیان یہ ہے کہ توراۃ ایک ہی وقت میں کئی زبانوں میں نازل ہوئی تھی،

---

[1] گولڈزیہر (عربی ترجمہ) مذاہب التفسیر الاسلامی۔ ص ۴

چنانچہ تورات (اور اس کے علاوہ خود) انجیل کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں، آرتھر جیفرے نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کے مقدمہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ تورات و انجیل کی تاریخ، ان کی نسبت اور صحت متن کو اعتبار و استناد سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

اختلاف متن اور صحیح متن کے تعین میں دشواری ... کا مطلب تو یہ ہوا کہ متن کی عبارت کئی طرح سے بلکہ متضاد صورتوں میں نقل کی گئی ہو، اور اس میں اصل صحیح متن کا تعین نہ کیا جا سکتا ہو، قرآن مجید میں ایسے کسی اختلاف متن کی مثال موجود نہیں ہے، قرآن مجید کی متواتر قراءتوں کو تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح اور مستند قرار دیا ہے، اور پوری طرح یقین اور اطمینان کے ساتھ آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے، ان مختلف قراءتوں سے لغت و ادب کے ذخیرہ کے فراوانی اور متن کی معنوی جہتوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس سے اجتہاد و استنباطِ قوانین کی مختلف سمتوں کے تعین میں مدد ملتی ہے، علمائے اسلام نے بڑی تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے، قرآن مجید کی جو قراءتیں مستند اور قطعی ہیں، وہ سب نہایت ہی صحت اور تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، اختلاف قراءت کا تعلق قرآن مجید کے ہر لفظ اور ہر ... آیت سے نہیں ہے، اس لیے گولڈ زیہر کا یہ دعویٰ کہ "اختلاف قراءت سے قرآن مجید کی کوئی بھی نص محفوظ نہیں" درست نہیں ہے، قرآن مجید کی یہ مختلف قراءتیں تسلیم شدہ ہیں، اس لئے ان میں تعیینِ متن کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سات حرفوں میں نزول قرآن مجید کا مطلب

یہاں ہم اس حقیقت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں، کہ پہلی بار کتابت قرآن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں ہوا تھا، جس میں تحریف کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سات حرفوں میں قرآن مجید کے نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ

اس کی کتابت بھی مختلف طریقوں سے کی گئی ہو، ان سات طریقوں کے مطابق صرف قراءت قرآن ہی ہو سکتی تھی، مختلف عرب قبائل مثلاً مضر، نزار اور ہذیل، اپنے لب و لہجہ اور بعض لفظوں کے تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لیے دعوت اسلامی کی ضرورتوں کی وجہ سے وقتی رخصت کے طور پر ان کو اپنے لب و لہجہ اور تلفظ میں تلاوت قرآن مجید کی اجازت دیدی گئی تھی، تاکہ آہستہ آہستہ وہ قریش کی زبان کے عادی ہو جائیں، قریش ہی کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ انہی کے لہجہ اور تلفظ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ ایک ہی تلفظ کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکے، اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اپنے نسخہ کی (جس کی نقلیں دوسرے علاقوں میں بھیجی گئیں) کتابت کروائی تھی، یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کے نسخہ کے مطابق تھا جو عہد نبویؐ میں لکھی گئی یادداشتوں سے نقل کیا گیا تھا، اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے دوسرے لوگوں کے (نامکمل اور بے ترتیب) قرآنی نسخوں کو نذر آتش کر دیا تھا، کیونکہ ان نسخوں کی کتابت میں قریش کی زبان اور ان کے تلفظ کی رعایت نہیں کی گئی تھی، حضرت عثمانؓ کا یہ عمل ایسا نہیں تھا جس کی وجہ سے ان پر اعتراض کیا گیا ہو، حضرت حفصہؓ کے نسخہ کو انہوں نے اس شرط پر واپس کر دیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد جلا دیا جائے گا، انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ نسخہ کسی کی نظر سے گزرا تو وہ اسی کے طرز تحریر کو اصل قرار دیکر یہ دعویٰ نہ کر بیٹھے کہ اسی کے مطابق کتابت ہونی چاہیے، حضرت حفصہؓ کا انتقال حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا ہے، اور ان کے نسخہ کو مروان بن حکم والی مدینہ نے جلوا دیا تھا،

قراءت سبعہ

ایک اور مسئلہ قرآن مجید میں قراءت سبعہ کا ہے، یہ قراءتیں براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقہ سے ثابت ہیں، نسخہ عثمانی میں چونکہ کتابت کی موجودہ شکلیں اور نقطے نہ تھے، اس لیے اس نسخہ سے ساتوں قراءتوں کے مطابق تلاوت ہو سکتی تھی، مثلاً قرآن

اس آیت یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا ۔ (النساء ۴: ۹۴) میں ایک قرات "فَتَثَبَّتُوْا" ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہیں، یعنی تحقیق کر لو اور معلوم کر لو، نسخۂ عثمانی میں نقطے نہ ہونے کی وجہ سے دونوں قراتیں ہو سکتی تھیں۔

قراتوں میں اختلاف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں معنوی تضاد پایا جاتا ہے۔ علامہ ابن الجزری نے لکھا ہے[1] کہ اس اختلاف کی صرف تین ہی قسمیں ہیں (۱) لفظ مختلف ہوں لیکن ان کے معنی ایک ہوں (۲) لفظ مختلف ہوں ان کے معنی بھی جدا جدا ہوں، لیکن ایک چیز میں دونوں معنی پائے جا سکیں (۳) لفظ و معنی دونوں جدا جدا ہوں، اس طرح کہ کسی ایک چیز میں دونوں معنی کا وجود ممکن نہ ہو لیکن کوئی دوسری صورت ایسی ہو جس سے دونوں معنوں میں تضاد باقی نہ رہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ	کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر
عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ	یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا
اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔ (النساء ۔ ۸۲)	تو لوگ اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔

صحیح روایات کے ذریعہ جو قراتیں مروی ہیں، ان کے قابل اعتماد ہونے کا گولڈ زیہر نے بھی اقرار کیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ

"قرآن کا ایک ہی متن موجود نہیں ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر ہم قرآن کے پیرایۂ بیان کے اختلافات میں ابتدائی تفسیری مراحل کو دیکھ سکتے ہیں، قرآن کا جو متن (مشہور قرات) رائج ہے وہ بھی اپنے جزئیات کے لحاظ سے ایک نہیں ہے، اس کی کتابت خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کی نگرانی میں مکمل ہوئی تھی، اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مختلف حلقوں میں کلام اللہ کی الگ الگ طریقہ سے روایت کیے جانے کا خطرہ نہ رہے۔"

[1] ابن الجزری: النشر ج ۱ ص ۴۹

اور فرائض عبادت کی ادائیگی میں قرآن کی تلاوت متفقہ ترتیب کے خلاف نہ ہو۔[1]

قرآن مجید کا ایک متن نہ ہونے کی بات غلط ہے، اور نہ کسی مسلمان کے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا کہ اس کے مختلف متن رہے، حضرت عثمانؓ کا بھی یہی خیال تھا، وہ صحیح قراتوں کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے صحیح اور متواتر قراتوں میں سے کسی ایک پر بھی پابندی عائد نہیں کی، کبھی کسی نے یہ رائے نہیں دی کہ مغرب اقصیٰ (مراکش اور تیونس وغیرہ) میں نافع کی روایت اور اہل مشرق میں حفص کی روایت کے رائج ہونے کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف ہو گیا ہے، ایک قرآن ہے جو مختلف قراتوں سے پڑھا جا سکتا ہے اور ان میں ہر ایک قرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور مستند ہے، مسلمانوں کا یہ طرز عمل زوار کا مرہون منت نہیں ہے، جیسا کہ گولڈ زیہر کا خیال ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ

"ان قراتوں میں اگر الفاظ کے معنوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہ ہو، تو سب سے پہلے اس معنی پر اعتماد کیا جائے گا، جو متن سے ظاہر ہوتا ہو، اس رائے کے مطابق اس عبارت کو پڑھنا جائز ہے، جو قرآنی مفہوم کے مطابق ہو، خواہ اس میں قرآنی الفاظ سے مطابقت نہ پائی جائے۔"[2]

قرآن مجید کی معنوی تلاوت کا کوئی بھی شخص قائل نہیں ہے، لیکن گولڈ زیہر نے ایک کاتب وحی عبد اللہ بن ابی سرح کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"رسول ﷺ مجھ سے مثلاً عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ لکھواتے تو میں یہ کہتا کہ اسی جگہ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ لکھ دوں تو آپ فرماتے ہاں! ہر ایک درست ہے۔"[3]

[1] گولڈ زیہر: مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۶ ۔ [2] ایضاً ص ۴۹

[3] گولڈ زیہر: مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۵۱ ۔

عبد اللہ بن ابی سرح مرتد ہو گئے تھے،[1] بعد کے لوگوں میں سے جنھوں نے عبد اللہ بن ابی سرح پر بہت زیادہ الزامات عائد کیے ہیں، ممکن ہے یہ اضافہ ان ہی لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عبد اللہ قرآن مجید میں تبدیلیاں کر دیتے تھے، اگر یہ روایت صحیح ہو تب بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کے دورِ ارتداد کی روایت ہے، مرتد کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں (اور پھر اس کے بعد تو وہ ... مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ (مترجم)) یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ رسول اللہؐ آیات قرآنی میں تبدیلی کی اجازت دیں، حالانکہ قرآن مجید میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا	اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی
بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا	ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ
يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ	جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے،
غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا	(آپ سے یوں) کہتے ہیں کہ اس کے سوا
يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ	کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائیے
تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا	یا (کم سے کم) اس میں کچھ ترمیم کر دیجیے،
يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ	آپ کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں
عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ	اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں،
(یونس - ۱۵)	بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو

[1] فاضل مقالہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے"، مگر یہ بات درست نہیں ہے، مسلمان ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک تو ٹھیک رہے، مگر پھر مرتد ہو گئے، اور فتح مکہ تک اسی حالت میں رہے۔ فتح مکہ کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو معاف کر دیا گیا اور علمائے اہل سنت کے نزدیک اس دورِ ثانی میں ایک مخلص اور سچے مسلمان کی طرح انھوں نے زندگی گزاری تفصیلات کے لیے دیکھیے اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۳، اور الاصابہ ج ۴ ص ۶۷ - ۷۰۔ (مترجم)

میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اگر
میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک
بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

اختلاف قراءت کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ رسم الخط کے فنی اشتباہ کو دور کرنا تھا، اور نہ یہ کہ اس کی مدد سے معنی و مفہوم کی تعیین میں مدد لینی تھی جیسا کہ گولڈ زیہر کا خیال ہے، مثلاً قرآن مجید کی آیت

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا	ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت
وَنَذِيرًا لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ	دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے،
وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ	تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر
بُكْرَةً وَأَصِيلًا (فتح - ۸ - ۹)	ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی
	تعظیم کرو اور صبح و شام اسکی تعظیم میں لگے رہو"

گولڈ زیہر کہتا ہے کہ

"تُعَزِّرُوهُ" (تم ان کی مدد کرو) کو بعض لوگوں نے "تُعَزِّزُوهُ" پڑھا ہے، میرے خیال میں متن میں اس تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں آیت قرآنی سے یہ مفہوم نہ اخذ کر لیا جائے کہ اللہ لوگوں سے مدد یا تعاون کا طلب گار ہے۔"[1]

گولڈ زیہر کے مذکورہ بالا استنباط میں دو غلطیاں ہیں:

پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ قراءت عامیانہ ہے، اس کا شمار نہ تو سات قراءتوں میں کیا گیا ہے، اور نہ ہی ان چودہ قراءتوں میں جو دیگر قسموں کو شامل کر کے زیادہ سے زیادہ شمار کی جا سکی ہیں، اس لیے علمی استدلال کے لیے اس پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

[1] مذاہب التفسیر الاسلامی، ص ۱۱ - ۱۲،

دوسری غلطی یہ ہے کہ زیادہ تر مفسرین نے "تعزروہ" کی تشریح کی ہے کہ "تم اللہ کی مدد کرو، اس کے دین اور رسول کی حمایت کر کے"۔ قرآن مجید میں اللہ کی مدد سے یہی مراد لیا گیا ہے، چنانچہ ایک جگہ ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (سورۂ محمد۔ ۷)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اسلئے قرآن مجید کی وہی تفسیر درست ہے، جو قرآن مجید سے ثابت ہو، گولڈ زیہر کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ متواتر اور شاذ قراءتوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا ہے، چنانچہ یہی غلطی اس نے سورۂ روم کی درج ذیل آیت میں بھی کی ہے:-

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۃ (الروم۔ ۱۔۲)

اہل روم ایک قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لیکر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے۔

وہ لکھتا ہے کہ

"غَلَبَتْ (صیغۂ معروف) بھی پڑھا گیا ہے، اس سے رومیوں کی اس فتح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان کو شامی سرحدوں پر عربی قبیلوں کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی، جن مسلمانوں نے اس قراءت کو تسلیم کیا ہے ان کے نزدیک اس میں بازنطینیوں کے خلاف نئی مسلم جماعت کی اس فتح کی خبر دی گئی تھی، جو اس وحی کے ۹ نو سال بعد حاصل ہوئی، ہمارے خیال میں مشہور قراءت اور اس قراءت میں معنوی فرق بہت زیادہ ہے، مشہور قراءت کے مطابق جو فتح پانے والے ہیں دوسری قراءت میں وہ شکست

دو چار ہوتے ہیں، پہلی صورت میں فعل ماضی کا صیغہ معروف استعمال ہوا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا صیغہ مجہول، لہذا کلام الٰہی کے ایک ہی فقرہ کی یہ دو مختلف قراءتیں ایسی ہیں جن میں انتہائی حد تک معنوی تضاد پایا جاتا ہے"۔[۱]

مندرجۂ بالا اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دوسری قراءت نہ تو صحیح ہے، اور نہ ہی متواتر، صحت اور تواتر کے لحاظ سے ایک ہی معیار کی دو قراءتوں میں موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر صحیح روایت کے مقابلہ میں کمزور روایت ہو تو صحیح روایت کو ترجیح دی جاتی ہے، نہ یہ کہ دونوں کو قبول کر لیا جائے، پھر اگر ہم بالفرض اس کو صحیح مان لیں تب بھی دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ دونوں قراءتیں دو الگ الگ موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ہر ایک اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعہ کے مطابق ہے، لیکن اگر گولڈ زیہر تعارض کے بجائے یہاں منطق کی اصطلاح تناقض کو ثابت کرنا چاہتے ہوں تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ منطق کے ماہرین کے نزدیک تناقض کی جو شرطیں متفق علیہ ہیں، وہ یہاں سرے سے معدوم ہیں تناقض اسوقت ہوگا جب کہ دو قضیوں کے درمیان کمیت، کیفیت اور جہت میں اختلاف ہو لیکن آٹھ باتوں میں اتحاد پایا جائے، مثلاً موضوع و محمول، زمان و مکان، اضافت و شرط، قوت و فعل اور جزء و کل، ان میں سے ایک یا چند باتوں میں اگر اتحاد نہ ہو تو ایسی صورت میں تناقض کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دونوں قراءتوں میں فتح سے متعلق موضوع ایک نہیں ہے، مشہور قراءت کے مطابق روم و ایران ہیں، اور شاذ قراءت کے مطابق روم اور عرب ہیں،

البتہ گولڈ زیہر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پر جو نوٹ لکھا ہے، تو اس میں اسنے تو تناقض کا مظاہرہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ

[۱] مذہب التفسیر الاسلامی۔ ص ۳۰۔۳۱

فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا (کہف - ۸۰) ہم کو اندیشہ (یعنی تحقیق) ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں پہلے ٹکڑے کی جگہ "وَخَافَ رَبُّكَ" ذکر کیا گیا ہے، جس پر گولڈ زیہر درج ذیل تبصرہ کرتا ہے کہ

"اس آیت میں چونکہ بات اللہ کے متعلق ہو رہی ہے، اس لئے ہمارا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ جو عبارتیں بظاہر اللہ کے شایانِ شان نہ ہوں ان سے قرأتوں کے اختلاف میں بچنا، ہر موقع پر پیش نظر نہ تھا۔"[1]

لیکن یہی گولڈ زیہر دوسری جگہ لکھتا ہے کہ

"قرآن مجید کے مقبول اور مشہور متن کے برخلاف متعدد قرأتوں کا سبب یہ خطرہ تھا، کہ اللہ اور اس کے رسول کے متعلق وہ فقرے آجائیں گے جو نامناسب ہیں۔ یا اللہ اور اس کے رسول کے لازمی احترام کے نقطۂ نظر سے وہ بے جوڑ ہیں۔"

گولڈ زیہر کی دونوں عبارتوں پر غور کیجئے تو ان سے کوئی نتیجۂ بحث سامنے نہیں آتا ہے ان کو پڑھکر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ فقروں سے بچنے کی وجہ سے قرأتوں میں اختلاف پیدا ہوا یا یہ کہ ایسی عبارتوں کے وجود سے اختلاف قرأت کی بحث کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاذ قرأتوں کی حیثیت عامیانہ روایات جیسی ہے عام لوگ بعض مرتبہ اپنی بے علمی نا سمجھی یا کم علمی کی وجہ سے صحیح واقعات اور مستند نثری اور شعری اقتباسات میں بھی تغیر و تبدل کر دیتے ہیں، اور اس بارہ میں ان کی یادداشت بھی ان کی صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر رہتی ہے، مگر ان عامیانہ قرأتوں کی وجہ سے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرتا ہے کہ ان کی بنیاد پر کسی نثر یا شعر کے

[1] مذاہب التفسیر الاسلامی۔ ص ۲۹۔

اصل متن میں تغیر کیا جائے یا اس عامیانہ روایت کو بنیاد بنا کر کسی شاعر یا نثر نگار پر تنقید کی جائے اسلام کے ابتدائی مصنفین اور مورخین نے جب مختلف علوم و فنون کی تدوین کی تو انھوں نے تمام چیزوں کو سمیٹنے اور ہر بات کو محفوظ کر لینے کی غرض سے ہر قسم کی روایتوں کو یکجا کر لیا، پھر جب نقد و تجزیہ ہوا تو مقبول اور صحیح روایات کی نشاندہی کی، اور شاذ روایتوں کو عامیانہ حکایتوں کی حیثیت سے جداگانہ طور پر ذکر کر دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ علمی تحقیق کا مدار مستند روایات پر ہوگا، نہ کہ عام روایتوں پر۔ جہاں تک متواتر قرأتوں کا تعلق ہے، تو ان میں ان قیاس آرائیوں اور من گھڑت توجیہ کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے جو صرف تخیل کی پرواز کا نتیجہ ہیں، اللہ کی ذات و صفات اور اس کے رسول کے اوصاف کا صحیح طور پر تو خود اللہ ہی کو علم ہو سکتا ہے، اور اس نے جو کچھ بیان کر دیا ہے وہی اس کے شایانِ شان ہے، گولڈ زیہر کے سرکش تخیل نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدافعت کے پردہ میں آپؐ کی دیانت و امانت کے بارہ میں شبہات پیدا کرے، اس سلسلہ میں اس نے قرآن مجید کی ایک آیت کی دو قرأتوں کا سہارا لیا ہے، آیت یہ ہے۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (آل عمران - ۱۶۱) قرأ سبعہ میں سے ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے يَغُلَّ کی روایت کی ہے، اور باقی چار ائمہ قرأت سے يُغَلَّ روایت کیا گیا ہے، پہلی قرأت کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ نبی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے ہی بالا ہی بالا کچھ لے لیں"[2] مقصد یہ ہے کہ نبی ایسے فعل سے بلند اور معصوم ہوتا ہے۔ نبوت اور خیانت دو متضاد چیزیں ہیں، اس لیے نبی کے بارے میں خیانت کا شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے موقع پر ایک سرخ چادر گم ہو گئی تھی جس پر کچھ منافقوں نے یہ بات کہی کہ ہو سکتا ہے، کہ وہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھ لی ہو، اس پر

[1] اضافہ از مترجم [2] (ترجمہ) اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں تمام نبیوں کی پاکبازی اور طہارت اخلاق کا اعلان کیا گیا ہے، مال غنیمت میں خورد برد، خیانت ہے، جس سے انبیائے کرام دور رہے ہیں۔

دوسری قراءت میں یُغَلَّ فعل مجہول استعمال کیا گیا ہے اس کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ کسی نبی کی سیرت ایسی نہیں ہوتی کہ اس پر اس کی امت خیانت کا کوئی الزام عائد کرے۔[1] بہرحال نتیجہ کے اعتبار سے اس قراءت کا بھی وہی مفہوم ہے، جو پہلی قراءت سے متبادر ہوتا ہے۔[2] لیکن گولڈزیہر یہ کہتا ہے کہ

"غالباً کسی مسلمان کو یہ بات نامناسب معلوم ہوئی ہوگی کہ نبی کی طرف کسی ناپسندیدہ کام کے لئے بطور مفروضہ ہی سہی، کوئی امکان برقرار رہے، خواہ اس میں تردیدی پہلو ہی اختیار کیا گیا ہو، چنانچہ زیادہ تر لوگوں نے فعل مجہول پڑھکر، متوقع شبہ کا ازالہ کر دیا، اب اس ناپسندیدہ مفروضہ کی نفی ہو گئی کہ نبی کسی نادرست فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے"۔[3]

گولڈزیہر کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے لفظ کو فعل مجہول میں اس لئے تبدیل کر دیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے خیانت کے الزام کو دور کیا جا سکے، لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کے کسی لفظ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تبدیلی نہیں کی تو پھر عام لوگ اس میں کسی ترمیم کی جرأت کیسے کر لیتے؟ آیت بالا کا باقی حصہ یہ ہے۔ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کی کوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خیانت سے

---

[1] تفسیر خازن: لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۱ ص ۴۴۱ ط دار الفکر ۱۹۷۹ء

[2] مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۴۰

بچنے کی دوسروں کو تاکید فرماتے تھے، ایک حدیث میں ہے کہ

الا لا أعرفن احدکم	دیکھو میرے علم میں یہ بات نہ آئے کہ تم
یاتی ببعیر له رغاء وببقرة	میں سے کوئی شخص (قیامت کے دن)
له خوار وبشاة لها ثغاء	اس طرح آئے کہ اس کے ساتھ اونٹ
فینادی یا محمد یا محمد! فأقول	ہو جو بلبلا رہا ہو، گائے ہو جو چیختی ہو، بکری
لا املك لك من الله شیئا	ہو جو بے قرار ہو، اور پھر یہ شخص بار بار
فقد بلغتك۔[1]	پکارے کہ اے محمد! اے محمد! اور میں
	یہ جواب دوں کہ خدا کے مقابلہ میں مجھے تمہارے
	بارے میں کچھ بھی اختیار نہیں میں نے تو پیام
	حق تم تک پہنچا دیا تھا۔

گولڈزیہر اگر تعصب سے پاک ہوتا، اور خالص علمی تحقیق اس کے پیش نظر ہوتی تو وہ ایک ایسے مفروضہ کو نہ چھیڑتا جس کا کسی نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت داری کے بارے میں شک پیدا کرنے کے لیے وہ ایک قراءت کی ایسی توجیہ نہ کرتا جو سرے سے بے بنیاد ہے، لیکن وہ تو اس فکر میں تھا کہ کوئی ہلکا سا نشان ملے اور اسے وہ بہانہ ثابت کر دے۔

تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ | اگر کسی قرآنی آیت میں کئی پہلو ہوں جن کے مطابق اس کی تفسیر کی جا سکتی ہو تو صحیح ترین اور قابل قبول تفسیر وہ ہو گی جو لغت اور محاورہ کے مطابق ہو، اور عقل اور شریعت کے خلاف نہ ہو، اور وہ تفسیر راہ حق سے بعید تر ہوگی، جو تعصب اور خواہش نفس کی پیداوار ہو۔ آیت قرآنی ہے کہ

---

[1] زمخشری: الکشاف ج ۱ ص ۳۵۸ ط مصر ۱۹۴۳ء

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ (السجدۃ - ۲۳)

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی تو آپ اس کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے۔

حداد نے مندرجۂ بالا آیت میں "لقائہ" کی تشریح کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"اس کی ضمیر سے الکتاب یعنی توراۃ مراد ہے، کیونکہ یہ کتاب عربی میں موجود ہے اور محمدؐ اس سے ملتے اور اس کے ماہرین سے رابطہ رکھتے ہیں، محمدؐ اور قرآن کا علمی سرمایہ، ہر صورت میں اسی کتاب سے ماخوذ ہے، اور یہ سب کچھ وحی اور کلام ربانی کی تنزیل سے الگ ایک ماخذ تھا۔"

لیکن کسی مفسر قرآن نے وہ معنی نہیں بتائے جو اس عیسائی مصنف نے بیان کئے ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات نہیں ملی تھی، یہاں موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملنے کا تذکرہ ہے یا دوسری رایوں کے مطابق، شب معراج یا بروز قیامت، موسیٰ علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یا ایک رائے کے مطابق آخرت میں موسیٰؑ کی اپنے رب سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے، علامہ آلوسی نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ ہی کی طرح موسیٰؑ کو بھی کتاب دی اور آپ ہی کی طرح ان پر بھی وحی اتاری اس لئے آپ کو اس بارہ میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کو موسیٰؑ ہی کی طرح کتاب اور وحی حاصل ہوئی ہے"[1]

"الکتاب" کے لفظ سے اگر تورات کو مراد لیا جائے تب بھی اس کی طرف ضمیر کو راجع کرنا

[1] الآلوسی: روح المعانی ج، ص ۱۳۰ - ط بیروت ۱۹۶۸ء

صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر تورات نہیں ملی، حداد نے تورات ملنے کے بارے میں ثبوت کے لیے درج ذیل آیت پیش کی ہے:

فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ ۚ (یونس - ۹۴)

پھر اگر بالفرض آپ اس (کتاب) کی طرف سے کچھ شک (و شبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے، تو آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے (کی) کتابوں (تورات وانجیل) کو پڑھتے ہیں۔

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ مذکورۂ بالا آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شک میں مبتلا ہو سکتے تھے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق اور طبری (ابن جریر) میں قتادہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب مذکورۂ بالا آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لا أشك ولا أسأل (نہ مجھے شک ہے اور نہ ہی ان سے پوچھوں گا)[1] اور یہی حداد حضرت عیسیٰؑ کی طرف کلمۃ اللہ اور روح اللہ کو بشر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ صفات ربانی کے طور پر نسبت دیتا ہے، حالانکہ صفات ربانی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور مذکورۂ بالا دونوں باتیں یا ایسے ہی دوسرے امتیازات کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ بشریت سے بالاتر نہیں ہوئے، حداد کا یہ بھی زعم باطل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ میں تورات وانجیل کی روشنی میں صفات الوہیت کامل طور پر پائی جاتی تھیں جیسا کہ قرآن نے اقتباسات پیش کئے ہیں ان کی تصدیق کی ہے اور ان کی صداقت کی شہادت دی ہے، حضرت عیسیٰؑ مخلوقات سے بالاتر ہو کر ایسی ذاتی صفت پا گئے، جو خالق ہی کے لیے خاص ہے" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:-

[1] الآلوسی: روح المعانی ج ۴ ص ۱۹۰ - ط بیروت ۱۹۶۸ء

"ہمیں ابتدا ہی سے یہ تسلیم ہے کہ ہم کو تورات و انجیل کی روشنی میں ان تمام مشترک باتوں کو سمجھنے کا حق حاصل ہے، جو قرآن میں غیر واضح رہ گئی ہیں، اس لئے کہ قرآن خود اپنی شہادت میں یا اس کے سمجھنے میں شک سے دوچار ہے، وہ ہمیں الکتاب (تورات) کے حوالہ کر دیتا ہے، جیسا کہ اس میں کہا گیا ہے، کہ "فَاِنْ کُنْتَ فِیْ شَکٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ"۔"[1]

وَکَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰی مَرْیَمَ	اللہ کا فرمان تھا جو اس نے مریم کی طرف
وَرُوْحٌ مِّنْهُ (نساء - ۱۷۱)	بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے،

اس آیت میں کلمہ کے لفظ سے فرمان تخلیق کُنْ (ہو جا) مراد ہے اور اللہ نے آدم میں بھی اپنی طرف سے روحِ حیات پھونک دی، لیکن اس نفخہ (پھونک) نے ان میں کوئی ایسی ذاتی صفت نہیں پیدا کی جو اللہ کے لئے خاص ہو، اس نے ان کو بشری حدود سے نکال کر الوہیت کا مقام نہیں دیا، اور جب یہ کہا جائے کہ کلمۃ اللہ تو اس اضافت سے، مضاف میں اللہ کے ذاتی اوصاف نہیں پیدا ہو جائیں گے، مثلاً خلیل اللہ اور کلیم اللہ وغیرہ خطابات بالترتیب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہیں، مگر اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان انبیاء میں اس نسبت کی وجہ سے اللہ کے اوصاف ذاتی بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

حداد کی اس بات کا کہ قرآن مجید خود اپنی شہادت میں یا اس کے سمجھنے میں شک سے دوچار ہے، کیا مطلب ہوا۔ کیا قرآن مجید کا وہی سرچشمہ نہیں ہے، جو نبیوں پر نازل ہونے والی تمام کتابوں کا تھا؟ قرآن نے تورات و انجیل کی اگر تصدیق کی ہے تو یہ ایک مقلد کی تصدیق نہیں بلکہ ایک محافظ اور نگہبان کی شہادت ہے۔

---

[1] المسیح فی القرآن - ص ۱۹۱ - ۱۹۲۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ	ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ	حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں سے جو کچھ
مِنَ الْکِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ	اس کے سامنے ہے اس کی تصدیق کرنے
(مائدہ - ۴۸)	والی اسکی محافظ و نگہبان ہے،

یہاں مُهَیْمِنْ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید گذشتہ کتابوں پر ایک شاہد بھی ہے حضرت حسانؓ کا ایک شعر اسی معنی میں ہے،

ان الکتاب مهیمن لنبینا	والحق یعرفه ذو والالباب

یہ کتاب قرآن، ہمارے نبی کے لئے ایک شہادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور حق کو عقلمند ہی پہچانتے ہیں۔

قرآن مجید پچھلی کتابوں کا محافظ ہے، اس لئے کہ اب اس کو نہ منسوخ ہونا ہے، اور نہ ہی اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوگا، اور اس نے حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ (اللہ کا فرمان) قرار دیا ہے کیونکہ اس کا فرمان اور حکم یہ ہوا کہ عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا جائے۔ وَاِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے، تو یہ فرما دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ کام ہو جاتا ہے) آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت عیسیٰؑ میں الوہیت پائی جاتی تھی، مگر اس کے باوجود حداد کو آیت کی ایسی تفسیر پر اصرار ہے جو اس کے مسیحی عقیدہ کے مطابق ہو، انجیل کے کسی فقرہ سے اس نے اپنی دل پسند بات ثابت کی ہوتی تو وہ شاہد معتد در سمجھا جاتا، مگر یہاں تو قرآن مجید کی روشن آیات ہیں، جنھوں نے مختلف موقعوں پر بار بار "کلمہ" کو الٰہ قرار دینے کی نفی کی ہے، قرآن مجید نے مسیح کو ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ (تین میں سے تیسرا) تسلیم کرنے سے قطعی طور پر ایسے واضح طریقہ سے انکار کیا ہے، جس میں کسی تاویل و توجیہ کی

کوئی گنجائش ہی نہیں۔ حداد کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ قرآنی آیات میں اپنی دل پسند تاویلات سے
باز رہتا لیکن وہ یہ لکھتا ہے کہ

"انجیل یوحنا کی ابتدائی بحث اس بارہ میں فیصلہ کن ہے، لیکن دونوں کتابوں
میں اصل پیچیدگی یہ ہے کہ "قرآن نے کلمۃ اللہ کا ربانی خطاب الوہیت سے مجرد کرکے آخر
کیونکر نقل کیا؟" صحیح حل یہ نہیں ہے کہ اس بارہ میں انجیل یا قرآن کے بیان کو رد کر دیا جائے
بلکہ دونوں کے درمیان ممکن حد تک تطبیق کی کوشش کرنی چاہیے۔"

چنانچہ اس نے تمام مفسرین کی دلیلوں کو رد کر دیا ہے، اور اپنی ناقابل قبول تاویلوں کے ذریعہ
اس نے قرآن مجید کی عبارت کو اپنے اصل معنی و مفہوم سے جدا کرکے، بقول خود انجیل اور قرآن مجید
کے درمیان ایسی مخفی لیکن حقیقی یگانگت پیدا کر دی ہے جو نسبتاً زیادہ قابل قبول ہے، اس ظاہری
تعارض کے مقابلہ میں جو ناواقف لوگ اس عبارت سے ثابت کرنا چاہتے ہیں[1]۔" حداد کی خام
خیالی یہ ہے کہ اس کے نزدیک

"قرآن کلمہ اور روح کی صفت ربانی کو اگر وہ ایک جوہر الٰہی کے لاہوت کے
ضمن میں ہو، رد نہیں کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کلمہ سے مراد جوہری محبت کا وہ ثمرہ
ہے جو ایک ذات الٰہی میں موجود ہے[2]۔"

مذکورہ بالا تشریح جو تعصب اور کینہ سے پُر ہے دراصل ایک شخص کی شعبدہ بازی ہے جو
ایک طرف تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھانا چاہتا ہے اور دوسری طرف اسی نسبت سے
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت کو گھٹانا چاہتا ہے، وہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی کے ساتھ
حضرت عیسیٰ اور انجیل کے تقدس کو اس وحی کے حوالہ سے ثابت کرتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] المسیح فی القرآن۔ ص ۲۰۶ [2] ایضاً ص ۲۱۵

پر نازل ہوئی تھی، اور پھر بڑی جرأت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض کرتے ہوئے
اپنی خام خیالی سے نکتہ چینی بھی کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

"مسیح نے دوسروں کی طرح، مسجد کے قریب اپنی بیویوں کے مکانات تعمیر نہیں کئے
تاکہ بعد نماز عشاء وہ ہر شب ان میں سے کسی ایک کے یہاں جاتے رہتے، وہ اپنی شب
اللہ کے سامنے دعاؤں میں گزار دیتے تھے، انھوں نے جنگ نہیں کی، اور نہ ہی اپنی
بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کی تاکہ جس کا نام نکلے اسے اپنے ساتھ لیجائیں، گویا
کہ وہ جنگ کے معرکوں میں بھی عورت سے جدا نہ رہ سکتے ہوں، بلکہ وہ اپنے شاگردوں سے
یہ کہا کرتے تھے، کہ میری خوراک تو یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے میں اس کی مشیت کو
نافذ کر دوں اور اس کے کام کو پورا کروں، مسیح کو آغاز میں اس بات کی ضرورت نہیں
پڑی کہ اللہ ان کا شرح صدر کرکے ان پر سے وہ بوجھ اتار دے جو ان پر بار گراں
بنا ہوا تھا، ان کو اپنے آخری عہد میں اس بات کی بھی ضرورت نہیں پڑی کہ اللہ ان کی
گذشتہ اور آیندہ غلطیوں کو معاف کرے۔"

حداد نے عباس محمود العقاد پر طنز کرتے ہوئے ان کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے
جو انھوں نے ہرگز کہیں لکھی نہ کہی نہ لفظوں میں اور نہ ہی اشاروں کنایوں میں مگر حداد
داستاں سرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"حوا کی طرف احتیاج سے صرف مسیح ہی بالاتر ہیں وہ غیر شادی شدہ رہے، اور
اسی حالت میں اٹھائے گئے یہ وہ کمال ہے، جس میں وہ منفرد ہیں یہ جنسی بیچارگی کا
نتیجہ نہ تھا، جیسا کہ عقاد نے طعن کیا ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہم سے ایک مستشرق
نے یہ کہا کہ نو بیویاں تو جنسی رجحانات میں زیادتی کا ثبوت ہیں، ہم نے جواب دیا کہ

حضرت عیسیٰؑ نے کبھی نکاح نہیں کیا، مگر آپ انہیں جنسی بیچارگی کا الزام نہیں دیتے، اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر نو بیویاں کی تھیں تو ان کو بھی جنسی میلان کی زیادتی کا الزام نہ دیجیے۔[1]

عقاد ایک صاحب ایمان شخص ہیں، اور وہ اپنے اسلامی عقیدہ کی وجہ سے کسی بھی نبی و رسول کی ذات پر طعنہ زنی کی جرأت نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ (البقرہ۔ ۲۸۵)

رسول ایمان رکھتے ہیں اس وحی پر جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی، اور (اسی طرح دیگر) مومنین بھی، ہر ایک کا ایمان ہے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ یوں کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے ہیں، پھر اسی حکم الٰہی اور عقاد کی مومن شخصیت کی طرف حداد نے وہ بات کیسے منسوب کر دی جو انھوں نے نہیں کہی، اور نہ ہی یہ خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوا، کچھ مستشرقین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے فاسد اغراض کو قرآن مجید میں تلاش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے یہ تو پڑھا کہ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ	کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم
وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ	اور حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے
الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝	آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے
(انشراح ۱-۳)	آپ کی کمر توڑ رکھی تھی۔

---

[1] المسیح فی القرآن۔ ص ۲۲۱-۲۲۲۔

لیکن اس کے بعد وہ رک جاتے ہیں، آگے نہیں پڑھتے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کی یاد کو بلند کر دیا)، وہ یہ تو پڑھتے ہیں کہ

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ	تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں
ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ۝ (الفتح۔ ۲)	معاف فرما دے۔

لیکن اس کے بعد یہ نہیں پڑھتے کہ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ (اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے)، دراصل نبیوں کے لیے شرح صدر سے مراد وہ نور الٰہی ہے جو ان کے دلوں میں اللہ کی طرف سے ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ ان سے تنگی اور تاریکی دور ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے رب سے یہ درخواست کی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (اے میرے رب میرا سینہ کشادہ فرما دے)

سورۂ الم نشرح میں جس وِزر (بوجھ) کا تذکرہ ہے، اس سے مراد گناہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض مستشرقین نے سمجھ لیا ہے، اس سے مراد ہے وہ بار گراں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے ہوئے تھے یعنی پیغام الٰہی کی وہ امانت جس کو دوسروں تک پہنچا دینے کی آپ پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی، نزول وحی کے وقت آپ پر طاری ہونے والی تھکن، قریش کی سرکشی، ان کی غلط کاریوں، ان کے ظلم و جور، شرک اور گمراہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی طور پر فکر مند رہا کرتے تھے، دین الٰہی کی امانت کا بار آپ پر ایسا ہی تھا، گویا کہ بھاری بھرکم بوجھ پیٹھ پر لاد دیا گیا ہو، اللہ نے یہ بار آپ پر سے اتار دیا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ پر مدینہ طیبہ کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی اور وہ فوج در فوج دین الٰہی میں آکر شامل ہوتے گئے، آپ کے پیرو جو بے بس تھے، اب طاقتور ہو گئے، جزیرۃ العرب سے شرک اور جاہلیت کا قلع قمع ہو گیا۔ اس کے باشندوں نے اطاعت قبول کی، اسلام پھیل گیا۔

اس پر یہ مزید عنایت ہوئی کہ اللہ نے آپ سے اپنی کامل رضا اور ہر نوع کی مغفرت کا وعدہ فرمایا۔

اسی طرح ساری دنیا میں اللہ نے آپ کے نام کو بلندی عطا فرمائی، چنانچہ کلمۂ شہادت میں، اذان میں، تشہد میں، قرآن مجید میں اور اہل ایمان کی طرف سے آپ پر درود پاک پڑھتے ہوئے جہاں کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے وہیں نام محمدؐ بھی ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔

حداد نے آیت قرآنی لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، کا بھی ذکر کیا ہے، حضرت سفیان ثوری نے "مَا تَقَدَّمَ" سے قبل نبوت دور جاہلیت میں آپ کے کاموں کو مراد لیا ہے، (جو اگرچہ بہتر اور درست تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وحی کی رہنمائی میں نہ ہوئے تھے، مترجم)، انھوں نے "مَا تَأَخَّرَ" کے معنی یہ کئے ہیں اور جو رہ گئے" یعنی آپ نے نہیں کئے، اور جیسا کہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اعطی من سراہ ومن لم یسرہ (اس نے ہر ایک پر بخشش کی جسکو دیکھا اور جس کو نہیں بھی دیکھا) اور ضرب من لقیہ ولم یلقہ (اس نے ہر ایک کو مارا جو ملا اور جو نہیں بھی ملا)، اسی طرح مذکورہ آیت میں معنی یہ ہونگے کہ آپ سے غلطیاں ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، بہر حال آپ کی خاطر وہ سب معاف کر دی گئیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلطیاں دوسروں کی طرح نہ ہونگی، مگر چونکہ ابرار کے لیے جو کام نیک اور قابل تعریف ٹھہرتے ہیں وہ مقربین کے یہاں کم رتبہ ہونے کی وجہ سے سیأت میں شمار کئے جاتے ہیں (حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ)[1]، اس لیے یہاں مقصود یہ ہے کہ بھول چوک اور تعبیر و ترجمانی میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی معاف کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر آپ کیلئے ذنب کا لفظ حقیقی نہیں بلکہ بطور مجاز کے استعمال ہوا ہے، اور یہ ذنب مجازی نہ تو آپ کی نبوت پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے آپ کی اخلاقی بلندیوں اور کمال شرافت پر کوئی حرف آتا ہے

---

[1] تفسیر الخازن ، لباب التاویل فی معانی التنزیل۔ ج ۴ ص ۱۸۸

اسلم روایت کرتے ہیں کہ شب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر پر تھے اور حضرت عمرؓ بن خطاب بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے حضرت عمرؓ نے آپ سے کسی چیز کے بارے میں کچھ پوچھا آپ نے جواب نہیں دیا، انھوں نے پھر سوال کیا آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا، انھوں نے پھر پوچھا مگر اب بھی کوئی جواب نہیں دیا، اس پر حضرت عمرؓ نے (اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) کہا کہ، اے عمر! تیری بربادی ہو کہ تو نے تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور انھوں نے جواب عنایت نہیں فرمایا، (پھر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ) میں نے اپنے اونٹ کی رفتار بڑھائی اور لوگوں کے پاس سامنے آگیا، مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے بارے میں قرآن مجید کی کوئی آیت نہ نازل ہو جائے مگر تھوڑی ہی دیر میں کسی نے مجھے آواز دی تو میں نے اپنجی میں یہ خیال کیا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی، پھر میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی، آپ کو سلام عرض کیا تو ارشاد فرمایا کہ آج شب میں مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا جہاں سے زیادہ محبوب ہے پھر آپ نے پڑھا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا...... (ہم نے تیرے لیے نمایاں فتح عطا کی....) رواہ الترمذی، یہ فتح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میدان میں نصیب ہوئی جس پر تاریخ بھی شاہد ہے۔

مستشرقین نے قرآن مجید کے بارہ میں گمراہی پھیلانے اور شک پیدا کرنے کے لئے جو اعتراضات کئے ہیں انکا جائزہ لینا اور پھر ان میں سے ایک ایک اعتراض کی تردید اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس موضوع کے ہر گوشہ کا احاطہ کرنے اور ان پر تفصیلی مباحث کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، جس کے لیے یہ مضمون ایک رہنما کا کام دے سکتا ہے، شاید یہی مقالہ علوم قرآنی کے ماہرین کو اس موضوع کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بن جائے، اور پھر وہ قرآن مجید کے ربانی سرچشمہ کو اور قرآن کی بے پایاں صداقت، اس کے ربانی تحفظ اور غیر معمولی استناد کو واضح کریں اور اس کی مختلف قراتوں اور اسکی واضح اور بے خطا تشریح و تفسیر پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں، علمی طور پر یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم مستشرقین کے بے سرو پا الزامات اور انکی نہ سرنا کیوں کا مداوا کر سکتے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم

پر

کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

(از ضیاء الدین اصلاحی)

(۳)

سید صاحبؒ نے ان کتابوں سے محض اپنے موضوع کی حدیثیں نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ احادیث اور ان کے مندرجات اور رواۃ پر مفصل بحث و تحقیق کی ہے، اور انھیں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے، جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے ماہر کی حیثیت سے راویوں اور حدیثوں کی قوت و ضعف اور صحت و سقم کا فیصلہ بھی کیا ہے، حدیثوں کے بارہ میں شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے، ایک مضمون کی دو یا کئی روایتوں کے فرق و اختلاف اور کمی بیشی پر گفتگو کی ہے، متعارض حدیثوں میں یا تو کسی کو ترجیح دی ہے، یا تضاد کو رفع کیا ہے، یا ان کے درمیان جمع و تطبیق سے کام لیا ہے۔

ہم اپنے گذشتہ مضمون میں سید صاحبؒ کی حدیث میں مہارت، وسعت علم و نظر، اور تحقیق و تدقیق کی کچھ مثالیں دے چکے ہیں، یہاں اس فن میں ان کے نقد و نظر کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔

واقعہ ہجرت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ کا ذکر حدیث میں

اس طرح آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نوخیز چھوکرا تھا، عقبہ بن معیط ایک قریشی کافر رئیس کی بکریاں مکہ میں چرایا کرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گذر ہوا، آپؐ نے مجھ سے کہا، لڑکے! تمھارے پاس دودھ ہے، ہم کو پلاؤ گے، میں نے کہا میں امین ہوں، تم کو نہیں پلا سکتا، آپؐ نے پوچھا اچھا کوئی بکری کا بچہ ہے، میں نے کہا ہاں ہے، فرمایا لے آؤ، میں لے آیا، حضرت ابوبکرؓ نے بچہ پکڑا اور آپؐ نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی حضرت ابوبکرؓ گھر ا پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا، پہلے آپؐ نے خود دودھ پیا، پھر ابوبکرؓ نے اور آخر میں میں نے پیا، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اے تھن! سمٹ جا، وہ سمٹ کر خشک ہو گیا، میں نے عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھایئے، فرمایا تم سیکھنے والے لڑکے ہو، تو میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منھ سے ستر سورتیں سیکھیں جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا، ابن سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کو دخل ہے، (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صفحہ ۶۲۱ - ۶۲۳)

اس روایت پر حضرت سید صاحب کا نقد و تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"یہ روایت مسند ابوداؤد طیالسی، مسند احمد بن حنبل، ابن سعد اور دلائل ابی نعیم میں ہے، طیالسی اور ابو نعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب مشرکین سے بھاگے تھے تب یہ واقعہ پیش آیا یعنی ہجرت کے ایام میں، طیالسی کی اس روایت کا سلسلۂ سند ہر طرح سے محفوظ ہے، ابوداؤد حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم بن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود حضرت ابن مسعودؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں، یہ تمام اصحاب ثقہ اور معتبر ہیں، بایں ہمہ اس واقعہ کو زمانہ ہجرت میں قرار دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب

بھول ہوئی ہے، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہجرت کے وقت نوخیز لڑکے تھے، اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے، بلکہ مسلمان بھی نہ تھے، حالانکہ وہ ہجرت سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے، وہ چھٹے مسلمان تھے، اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے اور وہاں سے اسوقت لوٹے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ جا چکے تھے، جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت سے جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے، ثابت ہوتا ہے، اس لیے وہ اسوقت مکہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھے۔ اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے یہ شکوک لکھ چکا تھا کہ رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا سب نے ان کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی، اسی اثنا میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہ یہی اعتراضات حافظ ابن حجر کے ذہن میں بھی گذرے ہیں، لیکن انھوں نے حسب دستور مختلف روایات کی تطبیق کے متعلق جو انکا عام اصول ہے اسی سے کام لیکر آگے بڑھ گئے ہیں، یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ ہجرت کے علاوہ کسی اور زمانہ کا واقعہ ہو مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں لیکن الحمد للہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۳۷۹) میں یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے جسمیں ان قابل اعتراض الفاظ کے بجائے مطلق یہ الفاظ ہیں کہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا اس میں فرار اور ہجرت کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے انکے شاگرد حماد بن سلمہ ہیں، اور دوسرے الفاظ کے راوی ان ہی کے شاگرد ابوبکر عیاش ہیں گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں، تاہم نتیجتاً وجوہ ابوبکر بن عیاشؓ کی تائید میں ہیں، پہلی روایت میں (فَرَّا بھاگے) اور دوسری میں مَرَّ (گذرے) کا لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے

کہ راویوں میں فَرَّا اور مَرَّا کے الفاظ میں باہم تشابہ ہو گیا ہے، اور بعد کو پھر اس کی مناسبت سے عَنِ المُشْرِکِیْن بڑھ گیا ہے، ابن سعد نے بسند حسن (جلد اول صفحہ ۲۲) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے جس سے تمام مسئلہ صاف ہو جاتا ہے حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں میں اپنے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا، میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے، میں نے عرض کیا نہیں، آپ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا فوراً دودھ اتر آیا تو میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں مانتا۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۳ ص ۲۲۱ و ۲۲۲ حاشیہ)

دوسری مثال کے لیے بحیرا راہب کا قصہ ملاحظہ ہو، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

"جب آپ دس بارہ برس کے تھے تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا اس نے آپ کو دیکھکر ان علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخرالزماںؐ یہی ہیں اس نے دیکھا کہ ابر آپؐ پر سایہ فگن ہے، جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے ہیں، اس کی شاخیں آپؐ پر جھکی آتی ہیں، اس نے آپ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابوطالب سے باصرار کہا کہ اس بچہ کو مکہ واپس بھیجدو ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو قتل کر ڈالیں گے (شاید اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا۔ دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے ظہور کا وقت آگیا ہے، اس لیے رومیوں نے تحقیق حال کے لیے ہر طرف اپنے دستے روانہ کیے ہیں، بحیرا نے ان سے کہا کہ خدا کی تقدیر ٹل نہیں

سکتی اس لیے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ" وہ رک گئے، اور ادھر ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس بھیج دیا، اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا اور بحیرا نے کیک اور ناشتہ آپ کے ساتھ کھایا۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے، مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں، اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقہ سند وہ ہے، جس میں عبدالرحمٰن بن غزوان جو ابونوح قراد کے نام سے مشہور ہے، یونس بن اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابوموسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابونعیم میں مذکور ہے، ترمذی نے اس کو "حسن وغریب" اور حاکم نے صحیح کہا ہے، استاذ مرحومؒ نے سیرت کی پہلی جلد (طبع اول ص ۱۳۰ و طبع دوم ص ۱۹۸) میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے اور عبدالرحمٰن بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے، اور حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رواۃ بھی جرح کے قابل ہیں

(۱) حضرت موسیٰ اشعریؓ مسلمان ہو کر ۷ھ میں یمن سے مدینہ آئے تھے اور یہ واقعہ اس سے ۵۰ برس پہلے کا ہے، حضرت ابوموسیٰؓ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سننا بیان کرتے ہیں، اس لیے یہ روایت مرسل ہے۔

۲۔ اس واقعہ کو ابوموسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں، مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انھوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے، یا نہیں، چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے، امام ابن حنبلؒ نے تو اس سے قطعی انکار کیا ہے، بنابریں یہ روایت منقطع ہے، اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ "وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں"۔

۳۔ ابوبکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں، یحییٰ کہتے ہیں کہ ان میں سخت بے پروائی تھی، شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے، امام احمدؒ ان کی اپنے باپ کی روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور "ایسی ویسی" کہتے ہیں، ابوحاتم کی رائے ہے کہ وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں، ساجی کا قول ہے کہ وہ سچے ہیں، اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے، ابو حاکم کا بیان ہے کہ "اکثر انکو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا"۔

۴۔ چوتھا راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، جس کا نام مستدرک اور ابونعیم میں ابونوح قراد ہے، اس کو اگرچہ بہت لوگوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے، ممالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے، ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ "اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے"۔ ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام لیث و مالک سے ممالیک والی حدیث نقل کرنے کی

وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔

۵۔ حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔ عبد الرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے، اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے بلال کو آپؐ کے ساتھ کر دیا، حالانکہ وہ اس وقت بچہ تھے، اور بلال پیدا بھی نہیں ہوئے تھے،

۶۔ حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے، حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں، کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں"۔ (مستدرک)

۷۔ امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے"، حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں، اس بے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے، (سیرۃ النبیؐ جلد ۳ صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۷)

یہ دو مثالیں ہی ایک حق پسند کے لیے حدیث میں سید صاحب کی معرفت و نکتہ شناسی اور بالغ نظری و دقیقہ رسی کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں، مگر جو لوگ اپنے اور اپنے حلقہ کے سوا کسی کو ایک لمحہ کے لیے محدث تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ان کے لیے تو دلائل کا انبار بھی بے سود ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (نمل ۱۴)

اور ظلم و تکبر کی بنا پر انھوں نے انکا انکار کر دیا حالانکہ انکے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔

شق صدر

شق صدر پر سید صاحب کی عالمانہ و محدثانہ بحث قابل مطالعہ ہے، مگر یہ حقائق اور نکتہ آفرینیاں بھی مولانا بدر عالم کے نزدیک سخت قابل اعتراض ہیں، ان کے اعتراضات کا حاصل یہ ہے کہ

۱۔ شق صدر کو صرف ایک ہی بار تسلیم کیا گیا ہے، جب کہ وہ متعدد مرتبہ ثابت ہے، لیکن دو مرتبہ صحیحین میں مذکور ہے، اور جمہور محدثین کا یہی مختار ہے، دوسرا واقعہ آپؐ کی طفولیت کا صحیح مسلم سے ثابت ہے، سید صاحب نے دور طفولیت کی روایت کو صحیح مسلم میں موجود ہونے کے باوجود اپنی رائے سے مجروح قرار دیا ہے،

۲۔ کسی نقل کے بغیر محض اپنے ظن و تخمین سے حماد بن سلمہ کی روایت کو ان کی آخری عمر کی قرار دیا ہے، جب ان پر سوء حفظ طاری ہو گیا تھا، یہ اہل فن کی تصریح کے خلاف ہے۔

۳۔ شق صدر کو صرف ایک روحانی واقعہ بنانے کی سعی کی گئی ہے، اسی لیے اس کا عنوان "شق صدر" کے بجائے شرح صدر بدل دیا گیا ہے، جس کا دوسرے لفظوں میں نام علم لدنی رکھ دیا گیا ہے، پھر اس علم لدنی کو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک انعام بتلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ممتاز صفت سے انکار کی یہ آخری سعی کی گئی ہے، حالانکہ صحیح مسلم کی اس روایت سے ایک طرف تو آپؐ کے دور طفولیت میں بھی شق صدر کا ثبوت ملتا ہے، دوسری طرف اس واقعہ کا جسمانی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

سید صاحب نے شق صدر پر جو محققانہ بحث کی ہے، اس پر کسی محدث اور استاذ حدیث سے اس بیجا اور نارواطنز کی توقع نہ تھی، لکھتے ہیں۔

"اس مضمون کو اتنے پیچ دار طریقے پر پھیلایا گیا ہے کہ جس سے صحیح مفہوم اخذ ہونا ہی مشکل ہو جاتا ہے، مگر اس تمام رام کہانی سے جو نقش آخر میں ذہن میں

قائم ہو کر رہ جاتا ہے، وہی ہے، جو ان سطور میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

(ترجمان السنۃ۔ صفحہ ۱۰)

سید صاحبؒ کی عالمانہ و محققانہ بحث تقریباً بیس صفحات پر مشتمل ہے، طوالت کے خوف سے اس کے انہی حصوں کو نقل کیا جائے گا جو مولانا بدر عالم کی ایرادات سے متعلق ہیں، ان کے خیال میں سید صاحبؒ نے ایک ثابت شدہ حدیثی اور تاریخی واقعہ کی تحریف اور علمی مشاہدہ کی تکذیب کی ہے، اور ان کی تاویل و توجیہہ کا مقصد معجزہ شق صدر کا انکار ہے، حالانکہ سید صاحبؒ تو صاف صاف یہ تحریر فرماتے ہیں۔

"منجملہ نبوت کے ان خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں، شق صدر یا شرح صدر بھی ہے، چنانچہ یہ رتبہ خاص بیش گاہ الٰہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوا ..... یہ مسئلہ کہ شق صدر واقع ہوا تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے، اور اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۳ ص ۴۸۲)

یہ اعتراض درست ہے کہ سید صاحب نے شق صدر کو ایک بار تسلیم کیا ہے مگر اس کے نتیجہ میں معترض کی جانب سے جو مزید باتیں کہی گئی ہیں، وہ غلط ہیں، اور "ذوق یکتائی" کا طنز بھی درست نہیں ہے، اس مسئلہ میں سید صاحب نے جو بحث کی ہے اس سے حسب ذیل باتیں صراحتاً معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ واقعہ شق صدر سید صاحبؒ کے نزدیک مسلم ہے، اس لیے اس کے انکار یا اس کی تحریف و بیجا تاویل کا اعتراض ان پر عائد کرنا خلاف واقعہ ہے۔

۲۔ شق صدر کی تمام روایتیں جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپؐ پر اس کیفیت کا گذرنا ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ چار موقعوں کو حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے تسلیم کیا ہے۔

۴۔ امام سہیلی صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، ایک دفعہ صغر سنی میں حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پانے کے زمانہ میں، اور دوسری دفعہ معراج میں۔

۵۔ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر منور ہو جانا ایک ہی دفعہ ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر بعض محدثین جیسے قاضی عیاضؒ وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ مانتے ہیں، مگر ان لوگوں کا اسے صغر سنی کا واقعہ ماننا جب آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پا رہے تھے، اور شب معراج میں اس کے ہونے کو راویوں کا سہو قرار دینا اصول روایت سے صحیح نہیں ہے۔

۶۔ واقعہ کی روایت کے مختلف طریقوں میں سب سے صحیح، سب سے مستند اور معتبر طریقہ وہ ہے، جس میں اس کا شب معراج میں ہونا بیان ہوا ہے۔

حضرت سید صاحبؒ نے شق صدر کے پانچوں موقعوں کی روایات کے سلسلۂ سند پر جو گفتگو اور راویوں کی قوت و ضعف پر جو بحث کی ہے، اس کو بھی مدنظر رکھا جائے تو فن حدیث سے ان کی واقفیت اور نقد و جرح میں مہارت کا اندازہ ہوگا، لیکن مولانا بدر عالم کا اصل اعتراض اور ان کی زیادہ برہمی اس روایت پر سید صاحبؒ کی تنقید کی وجہ سے ہے، جس میں حضرت حلیمہؓ کے یہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس روایت کے تمام سلسلوں پر سید صاحبؒ نے محدثین اور ائمۂ فن کے حوالہ سے بڑی عالمانہ بحث و تنقیح کرکے بتایا ہے کہ یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے منقول ہے، مگر ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمامتر خالی ہیں، اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجہ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

وہ

اس حدیث کے مختلف طرق پر سید صاحبؒ نے کئی صفحوں میں جو بحث کی ہے

حدیث میں ان کی دیدہ وری کا ثبوت ہے، مگر طوالت کے خوف سے یہاں صرف روایت کے سب سے محفوظ اور صحیح سلسلۂ سند پر سید صاحبؒ کی تحقیق و تنقید کو نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، کیونکہ معترض اسی پر زیادہ چیں بجبیں ہوئے ہیں، مصنف سیرت فرماتے ہیں۔

"اس سلسلۂ سند کے محفوظ اور صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحاح میں معراج اور شق صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے قتادہؒ، زہریؒ، شریکؒ اور ثابتؒ بنانی، چار شخص ہیں، ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں، سلیمانؒ بن مغیرہ اور حمادؒ بن سلمہ، حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے، ان سب میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شق صدر کا ذکر ہے۔

لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شق صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں، اور شق صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے کوئی بلکہ حماد کے دوسرے ہم درس طلبہ میں سے بھی کوئی ان کی تائید نہیں کرتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے معراج کی حدیث حماد کے واسطے سے نقل نہیں کی ہے، حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے، کہ آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اسی سبب سے امام بخاریؒ نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں، امام مسلمؒ اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابیٔ حافظہ سے پہلے کی جو ان کی روایتیں ہیں ان ہی کو چن کر اپنی کتاب میں لائے ہیں، میرا میلانِ تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابیٔ حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انھوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شق صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو دو کر دیا،

میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلمؒ بھی اپنی ترتیب بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ بتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد کو غلطی ہوئی ہے، چنانچہ واقعات معراج کے ذکر میں امام مسلمؒ یہ کرتے ہیں کہ پہلے حضرت انسؓ سے ثابت کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں، جس میں معراج کے شق صدر کا ذکر نہیں ہے پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے، جس میں شق صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے، اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شق صدر کا تذکرہ ہے، بعد ازیں حضرت انسؓ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں، جس میں شق صدر اور معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں، جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی، مثلاً یہ کہ شق صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گذری ہو، مگر بہر حال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا، گذشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حسد، بغض، حصۂ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت، شفقت، ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینہ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں، بایں ہمہ حماد حضرت انسؓ سے روایت کر کے کہتے ہیں کہ "آپ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھکو (جیسا کہ مسلم میں ہے) یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے"۔ اگر یہ جسمانی واقعہ بھی تھا، تو حضرت انسؓ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حماد کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں، یہ مذکور نہیں، علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل شمائل کا ایک ایک حرف، جسم اطہر کے ایک ایک خط و خال تک کی کیفیت صحابہ نے بیان کی ہے، مگر کسی نے سینہ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام

نہیں یا، ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے۔" (سیرۃ النبیؐ ص ۴۹۵ تا ۴۹۸)

حماد کی روایت پر حضرت سید صاحبؒ کا نقد و تبصرہ نہایت محتاط اور ذمہ دارانہ ہے، ان کو اعتراف ہے کہ اس روایت کا سلسلۂ سند صحیح اور محفوظ ہے، مگر اس کے ناقابل تسلیم ہونے کی اصل وجہ حماد کا تفرد اور تمام راویوں سے ان کا اختلاف ہے، لیکن مولانا بدر عالم نے اس بنیادی وجہ کو نظر انداز کر کے سید صاحبؒ کی غایت احتیاط پر مبنی رائے کو محض ظن و تخمین قرار دیا ہے، ان کا سارا اعتراض اس پر ہے کہ حماد کی روایت کو کیوں ان کے حافظہ کی خرابی کے زمانہ کی قرار دیا گیا ہے، اور کیوں شق صدر کو ایک روحانی معاملہ بتایا گیا ہے، فرماتے ہیں۔

"تاویل کرنے والوں نے یہاں صرف انہی قیاس آرائیوں پر بس نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فن حدیث کے لحاظ سے بھی اس مستحکم قلعہ کو مسمار کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ لکھدیا ہے کہ اس واقعہ کا راوی حماد بن سلمہ ہے جن پر آخری عمر میں سوئے حفظ طاری ہو گیا تھا، اور کسی نقل کے بغیر محض اپنے ظن و تخمین سے صحیح مسلم کی اس روایت کو اسی زمانے کی روایت قرار دے ڈالا ہے" (ترجمان السنہ ص ۵)

آگے مولانا فرماتے ہیں کہ بھلا مسلم جیسے بڑے امام و محدث کو یہ تمیز کیسے نہ ہوتی کہ کون سی روایت سوئے حفظ سے پہلے کی اور کون سی بعد کی ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ استثنائی صورت بھی بیان کی ہے "الا یہ کہ اس جگہ کوئی خصوصی علت نکل آئے"۔ اس استثنا سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح روایتوں میں بھی بعض مخصوص حالات کی وجہ سے قدح و عیب کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اسی سبب محدثین نے روایات میں ترجیح کے اصول مقرر کئے ہیں، مگر جب سید صاحبؒ نے استثنائی قاعدہ کے رو سے اس حدیث کی بعض علتوں کا ذکر حد درجہ محتاط انداز میں کیا تو یہ مولانا کے نزدیک

رام کہانی ہو گئی، اور اس سے حدیث کے مستحکم قلعہ میں شگاف پڑ گیا، وہ سید صاحبؒ کو علت قادحہ کی تمیز کا اہل نہیں سمجھتے اسی لئے یہ ناروا اور غیر عالمانہ طنز فرماتے ہیں

" ان دقائق کو وہ شخص کیسے ادراک کر سکتا ہے، جو مورخین کی صف میں سے نکل کر محدثین کی جماعت میں گھسنے کی کوشش کرتا ہو، اور بھول گئے "لکل فن رجال" اس کو یہ علم کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ کسی شیخ کو سوئے حفظ کس زمانے میں اور کیوں طاری ہوا تھا، اور یہ تمیز کیسے حاصل ہو سکتی ہے کہ اس نے کس شیخ سے کس کس زمانے میں روایات اخذ کی ہیں، اس لئے اس بیچارہ کو صرف اپنے ظن و تخمین سے حکم لگا دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (ص ۶)

اس کے بعد انھوں نے پورا زور حماد کو ثقہ ثابت کرنے پر صرف کیا ہے، یہ واضح رہے کہ سید صاحبؒ نے حماد کو مجروح نہیں قرار دیا ہے، صرف آخر عمر میں ان کے حافظہ کی خرابی کا ذکر کیا ہے، جو تمام ائمۂ فن کے نزدیک بھی مسلم ہے، اس سے ان کا مدعا یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حماد کی جس قدر حدیثیں نقل کی ہیں وہ حافظہ کی خرابی سے قبل کی ہیں، مگر اس پوری بحث میں کہیں سید صاحب کے ان اشکالات سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، جو انھوں نے اصول روایت و درایت کے مطابق حماد کی روایت کے بارے میں ظاہر کئے ہیں، اس غلط بحث میں خود مصنف ترجمان السنہ سے بھی دو عجیب غلطیاں ہو گئی ہیں۔

۱۔ اوپر گذر چکا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حماد کی روایتیں سرے سے درج ہی نہیں کی ہیں، چاہے وہ ان کے حافظہ کی خرابی کے زمانہ سے پہلے کی ہوں یا اس کے بعد کی، مولانا حماد کی توثیق اور سید صاحب پر طنز و تعریض کے جوش میں امام بخاریؒ پر بھی اس طرح زبان طعن دراز کر بیٹھے ہیں۔

"اور جن ائمہ نے حماد بن سلمہ کی روایات کو مطلقاً نہیں لیا یہ محض ان کا تشدد اور ناانصافی ہے۔" (ترجمان السنۃ ج ۱، ص ۲۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معترض امام بخاری کے تشدد ہی کو بیجا اور ناروا نہیں خیال کرتے بلکہ ان پر ناانصافی کی تہمت بھی عائد کرتے ہیں، حالانکہ آگے اسی کو ان کی شان احتیاط اور شرائط تشدد کی بات کہا ہے۔ اب پتہ نہیں وہ اسی شان احتیاط اور شرائط تشدد کی بات کہنے پر سید صاحبؒ سے کیوں اس قدر برہم ہیں، اوپر معترض کی اس شکایت کا ذکر بھی آچکا ہے کہ سید صاحبؒ نے محدثین کبار سے بدظنی پیدا کی ہے، کیا معترض کے نزدیک امام بخاریؒ محدثین کبار کی فہرست میں ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کیا انھوں نے ان کی جانب بیجا تشدد اور ناانصافی کو منسوب کر کے ان سے بدگمانی پیدا کی ہے یا نہیں ؟

۲- حماد کی توثیق میں انھوں نے امام بیہقیؒ کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس کے ترجمہ میں ان سے سہو ہو گیا ہے، ملاحظہ ہو۔

قال البیهقی هو احد ائمة	امام بیہقی کہتے ہیں کہ حماد بن سلمہ مسلمانوں
المسلمین الا انه لما کبر ساء	کے ائمہ میں سے ایک امام ہیں لیکن آخری
حفظه فلذا ترکه البخاری	عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا، اس لیے
واما مسلم فاجتهد واخرج	امام بخاریؒ نے تو ان کو بالکل ترک کر دیا،
من حدیثه عن ثابت ما سمع	لیکن امام مسلم نے کوشش کر کے ان کی وہ
منه قبل تغیره وما سوی	احادیث اپنی صحیح میں سے نکال لیں
حدیثه عن ثابت لا یبلغ	جو انھوں نے ثابت سے اپنے سوء حفظ
اثنی عشر حدیثا اخرجها فی	کے زمانہ سے قبل روایت کی تھیں اور اس کے سوا

الشواهد -	جو حدیثیں انھوں نے ثابت سے روایت کی ہیں
	جن کی تعداد بارہ ۱۲ حدیثوں تک بھی نہیں
	پہنچتی وہ صرف شواہد میں روایت کی ہیں (اصول میں نہیں)

مذکورہ بالا عبارت میں واخرج من حدیثہ الخ کا ترجمہ صحیح نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم نے حماد کی وہ احادیث اپنی صحیح میں نقل و بیان کی ہیں جو انھوں نے ثابت سے اپنے حافظہ کی خرابی کے زمانے سے پہلے روایت کی تھیں۔

امام بیہقیؒ کا یہ بیان مصنف ترجمان السنۃ نے امام بخاریؒ کے بیجا تشدد و ناانصافی اور امام حماد کی توثیق کے ثبوت میں نقل کیا ہے لیکن اہل نظر خود فیصلہ کریں کہ کیا امام بیہقیؒ نے اس میں کہیں امام بخاریؒ کے بیجا تشدد و ناانصافی کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی کیا ہے، یا خود معترض ہی جوش غضب میں امام بخاریؒ کی شان میں نازیبا بات لکھ گئے ہیں۔

اب رہا حماد کی توثیق کا معاملہ تو امام بیہقیؒ کے بیان میں ان کی اسی قدر توثیق کی گئی ہے جس قدر سید صاحبؒ نے کی ہے، اور اس بیان سے ترجمان السنۃ کے مصنف کی تائید کے بجائے خود سید صاحبؒ کی تائید ہوتی ہے، امام بیہقیؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حماد ائمہ مسلمین میں ہونے کے باوجود بڑھاپے میں سوء حفظ میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی بنا پر امام بخاریؒ نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی ہے البتہ امام مسلمؒ نے اپنے اجتہاد و فہم سے ان کی مرویات کی دو قسمیں کر دی ہیں، ایک بڑھاپے اور سوء حفظ کے زمانے سے پہلے کی روایات جن کو انھوں نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے، اور دوسری قسم کی روایات بڑھاپے اور سوء حفظ کے زمانہ کی ہیں، ان کو صرف شواہد و متابعات میں نقل کیا ہے، بعینہ یہی باتیں حماد کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے مذکورہ بالا اقتباس میں گذری ہیں، لیکن ترجمان السنۃ کے مصنف کو امام بیہقیؒ کا بیان تو اپنی تائید میں معلوم ہوا، اور سید صاحبؒ کا اقتباس ام کہانی یا للعجب!

امام بیہقیؒ کے بیان کا آخری حصہ بہت قابل غور ہے، محدثین شواہد و متابعات میں جو حدیثیں لاتے ہیں ان میں اس درجہ احتیاط اور صحت کو ملحوظ نہیں رکھتے جس درجہ اصول میں صحت و احتیاط کا لحاظ کرتے ہیں، سید صاحب نے امام مسلمؒ کی ترتیب بیان کے اشارات سے بھی یہی سمجھا ہے کہ وہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد کی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں، اگر حماد کی اس روایت کو شواہد کی سمجھا جائے تو سید صاحبؒ نے اپنے میلان تحقیق کا جس احتیاط سے ذکر کیا ہے، وہ یقیناً صحیح ہے، مگر سید صاحبؒ نے مزید احتیاط کی بنا پر اپنے میلان تحقیق پر اصرار نہ فرما کر آخر میں دونوں روایتوں میں توفیق و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اس تشریح و تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینہ مبارک سے حصہ شیطانی جو ہر انسان کے اندر ہے اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے، ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے"۔ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۴۹۷)

یہ تحقیق و احتیاط اگر کسی کے خیال میں رام کہانی، قیاس آرائی اور ظن و تخمین ہے، تو اس کا کیا علاج؟

مولانا بدر عالم اس پر بھی معترض ہیں کہ سید صاحبؒ نے شق صدر کو روحانی معاملہ قرار دینے کے لیے اس کے بجائے شرح صدر کو صحیح اصطلاح بتایا ہے، اور پھر اسے علم لدنی اور روحانی انعام وغیرہ قرار دے کر نہایت پیچ دار بنا دیا ہے، اور اس سلسلہ میں اپنے موقف کا ہمنوا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی زبردستی ٹھہرایا ہے، اس لئے اجمالاً اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شق صدر اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں ہمیشہ سے مسلمانوں میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں، ایک جماعت ظاہر بین لوگوں کی ہے، یہ جماعت ظاہری الفاظ سے جو عام اور سیدھا سادہ مفہوم نکلتا ہے اسی کو مان لیتی ہے، چنانچہ اس کے خیال میں شق صدر کا مطلب یہ ہے کہ واقعی سینہ مبارک چاک کیا گیا اور قلب اقدس کو آب زمزم سے دھو کر ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا، لیکن دوسری جماعت نکتہ شناس محققین اور حقیقت بیں صوفیہ کی ہے، یہ لوگ الفاظ کے ظاہری مفہوم کے بجائے ان کی اصل حقیقت و روح کو معلوم کرتے ہیں، اس لیے حضرت سید صاحبؒ کے بقول "ان تمام غیر محتمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کے حقائق ہیں، جہاں روحانی کیفیات، جسمانی اشکال میں اس طرح نظر آتے ہیں، جس طرح حالت خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں، اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں"۔ (ص ۴۰۹) سید صاحبؒ کے نزدیک شق صدر کے واقعہ کی یہی نوعیت ہے، اس لیے انھوں نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اس کیلئے مناسب اور صحیح اصطلاح شرح صدر کی ہے، قرآن مجید میں بھی اسی کا ذکر ہے اور احادیث میں گو شق صدر کا لفظ بھی آیا ہے، تاہم شرح صدر سے وہ بھی خالی نہیں ہیں، خود صحیح مسلم میں بھی یہ لفظ ایک روایت میں مذکور ہے، سید صاحبؒ کے نزدیک علم لدنی بھی اسی حقیقت کی ایک تعبیر ہے، مولانا بدر عالم نے پہلے نقطۂ نظر کو قبول کیا ہے، ان کو اس کا حق ہے، لیکن دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار کرنے والوں پر ان کی برہمی بلاوجہ ہے، کیا سید صاحبؒ جیسے محقق کو یہ حق نہیں کہ وہ اس نظریہ کو قبول کریں جو ان کے نزدیک دلائل کی روشنی میں قوی اور صحیح ہے۔

سید صاحبؒ نے اس موقع پر ایک اہم حقیقت اور بلیغ نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی حالات و واقعات میں سیر ملکوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس بنا پر سرور انبیاءؐ کی زندگی میں بھی سیر ملکوت یا معراج نہایت اہتم بالشان واقعہ ہے، اس میں بیش گاہ الٰہی سے آپؐ کو نہایت عجیب اور گوناگوں بشارتیں ملیں اور احکام و انعامات سے نوازے گئے، شرح صدر یا شق صدر بھی اسی سلسلہ کا ایک انعام ہے

چنانچہ سید صاحبؒ نے معراج کے موقع پر اسے دئے جانے کی حکمت اور اس کی اہمیت بھی بیان کی ہو۔ ملاحظہ ہو (صفحہ ...)

مگر افسوس کہ ان حقائق و نکات کو جو لعل و جواہر سے بھی بیش قیمت ہیں مولانا بدر عالم خزف ریزے کا درجہ بھی دینے کے لیے تیار نہیں اور وہ انھیں رام کہانی قرار دیکر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

دوسرے نقطہ نظر کے حامیوں میں سید صاحبؒ نے صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا نام اسلئے لیا ہے کہ ان کے بقول "علمائے اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے، جو صوفی اور صاحب حال بھی ہو اور محدث و متکلم بھی یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلویؒ (صفحہ ۴۴۴)، سید صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ چونکہ ایک بیگانہ کیلئے اس نادیدہ شہرستان کی ہو بہو تشریح اپنی زبان میں مشکل ہے اس لیے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، (صفحہ ۴۴۵) مگر مولانا بدر عالم اس پر بہت طیش میں آگئے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ پر تنہا انکی اجارہ داری ہے، اور صرف وہی ان کے اسرار کے واقف کار اور حامل ہیں، غالباً اسی وجہ سے انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو شاہ ولی اللہؒ کے طریق سے ناواقف بھی بتایا ہے، شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے۔

اما شق الصدر وملؤه ايمانا	لیکن سینہ کو چاک کرنا اور اس کو ایمان سے
فحقيقته غلبة انوار الملكية	بھرنا اسکی حقیقت انوار ملکیہ کا روح پر
وانطفاء لهيب الطبيعة و	غالب ہوجانا اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا
خضوعها لما يفيض عليها من	بجھ جانا اور عالم بالا سے جو فیضان ہوتا
حظيرة القدس۔	ہے، اس کے قبول کے لیے طبیعت کا
(حجة الله البالغة ج ۲ ص ۲۰۵)	آمادہ ہوجانا ہے۔

اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب شق صدر کو ایک روحانی اور تمثیلی واقعہ خیال کرتے تھے، اس لئے سینہ مبارک کے چاک کئے جانے اور اسے دھو کر ایمان و حکمت سے بھرنے کی حقیقت یہ بتاتے ہیں کہ اس سے آپؐ کے قلب پر ملکوتی انوار کا غالب ہونا، طبیعت بشری کے اشتعال کا فرو ہونا اور حظیرۃ القدس کے

فیوض و انعامات کے قبول کے لیے طبیعت کا آمادہ ہونا مراد ہے،

فضائل و معجزات کی روایات میں تساہل

یہ اعتراض بھی صحیح ہے کہ سید صاحبؒ عقائد و احکام اور فضائل و ترغیبات کی احادیث میں تفریق کو پسند نہیں کرتے اور انھوں نے بعض محدثین کے اس قاعدہ سے اختلاف کیا ہے کہ اول الذکر میں شدت اور موخر الذکر میں نرمی اور تساہل روا ہے، مولانا بدر عالم کے نزدیک دونوں قسم کی روایتوں میں تفریق معقول ہے، اور وہ اسے محدثین کے تساہل کے بجائے ان کی مراتب شناسی کا نتیجہ بتاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ "ہر جگہ شدت اختیار کرنے سے سیرت اور فضائل کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔" اس اعتراض کے جواب میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ محدثین کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ موضوع حدیثوں کی روایت حرام ہے چاہے وہ احکام و عقائد سے متعلق ہوں یا فضائل اور ترغیب و ترہیب سے، مگر بعض محدثین نے فضائل و ترغیبات میں انکی نقل و روایت کی اجازت دی ہے، لیکن ظاہر ہے اس نرمی اور رخصت کا یہ مطلب نہیں کہ فضائل و ترغیبات اور دلائل و معجزات کو تمام تر قصہ و افسانہ یا عجائب و غرائب کی داستان بنا دیا جائے، اگر ایسا کوئی سمجھتا ہے تو اس نے نہ ان محدثین کی صحیح مراد کو سمجھا اور نہ ان کے ساتھ اس نے انصاف کیا، فضائل و معجزات میں اگر ضعیف روایتوں کی تحریر و بیان کی کھلی چھوٹ دیدی جائے تو دین قصص و عجائب کا ایک طومار ہو جائے گی، اس موقف کی تائید سلف کے اقوال و اعمال سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرو بن دینارؒ سے روایت ہے کہ تمیم داریؓ نے حضرت عمرؓ سے قصوں کی روایت کی اجازت چاہی تو انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی، علامہ عراقی کا بیان ہے کہ تمام صحابہ عادل و امین تھے، جب حضرت عمرؓ کو ایک صحابی کو قصوں کی روایت کی اجازت دینے میں تامل ہوا، تو تابعینؒ اور ان کے بعد آنے والوں کو اس کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ سنن ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ قصہ گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کے زمانہ میں نہ تھی، (موضوعات ملا علی قاری، صفحہ ۱۴)

امام احمدؒ فرماتے ہیں، حدیث کی بدترین قسم غرائب ہے ان پر عمل و اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں، غریب حدیثوں کے پیچھے پڑنے والے جھوٹے ہیں (کتاب الکفایہ خطیب صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۲)

ان اقوال کی روشنی میں معجزات و فضائل کی روایتیں ملاحظہ کیجیے کہ کیا ان کی حیثیت قصوں اور غرائب سے کچھ مختلف ہے، تفصیل کے لئے خود سیرۃ النبیؐ جلد سوم ملاحظہ ہو، یہاں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں، اس لیے صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس تفریق کے وجوہ جو کچھ بھی ہوں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس اصول کی بنیاد کیا ہے، جرح و تعدیل کا دار و مدار محدثین کے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حجرات ۵۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو۔

یہ حکم مطلق ہے، اور اس میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ صرف احکام و عقائد ہی کی حدیثوں میں چھان بین ہونی چاہیئے، باقی دوسری قسم کی حدیثوں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینا چاہیئے، مشہور حدیث ہے کہ جس نے قصداً مجھ پر کوئی جھوٹ گڑھا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم کو بنایا، اس مفہوم کی اور حدیثیں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وعید ایک خاص قسم کی حدیثوں ہی کے بارہ میں ہے، اس بنا پر محدثین نے جو قاعدہ بنایا ہے اسکی بنیاد کسی نص پر نہیں معلوم ہوتی، امام دار قطنیؒ کا بیان ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے سے جھوٹی روایتیں کرنے والے کو جہنم کی تہدید بھی فرمائی ہے، اور اس کا حکم بھی دیا ہے کہ آپؐ کے ارشادات دوسروں تک پہنچائے جائیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف حق و صحیح کو پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور سقیم و باطل کی روایت کرنے سے منع کیا ہے، اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپؐ سے

رطب و یابس جو کچھ منقول ہے ان سب کو بیان کیا جائے اور دوسروں تک انہیں پہنچایا جائے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرنے لگے، پس جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارہ میں اسے یہ شک ہو کہ وہ صحیح ہے یا غیر صحیح، وہ بھی جھوٹا ہے، کیونکہ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں، (جو مجھ سے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جسے وہ جھوٹی خیال کرتا ہو) آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ جسے وہ جھوٹی یقین کرتا ہو، بلکہ صحت میں ذرا بھی شک و شبہ ہو جانے پر اسے آپؐ نے چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی ہے اسی بنا پر خلفائے راشدین اور برگزیدہ صحابہؓ کرام تکثیر روایت سے احتراز کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے جب کوئی ایسی حدیث بیان کی جاتی جو انہیں نہ معلوم ہوتی تو وہ اس کے لیے ثبوت اور گواہ کا مطالبہ کرتے تھے، اور دھمکی بھی دیتے تھے، حضرت علیؓ ایسے موقع پر لوگوں سے قسمیں لیتے تھے، صحابہ و تابعین میں محتاط لوگ بھی آپؐ کی جانب کوئی بات منسوب کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔" (موضوعات ملا علی قاری، صفحہ ۱۹)

اس بنا پر مولانا بدر عالم کا یہ فرمانا کہ سید صاحب کا وعید کی لپیٹ میں ضعیف حدیثوں کو لینا خلاف تحقیق ہے، درست نہیں، امام دار قطنیؒ کے مرتبہ میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ انھوں نے صحیح کے مقابلہ میں غیر صحیح کہا ہے، جس میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہیں، محدثین نے بنیادی طور پر حدیث کی تین ہی قسمیں قرار دی ہیں (۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف یا سقیم، ان میں سے ہر قسم کی متعدد قسمیں ہیں، اور ضعیف کے اقسام میں موضوع و منکر بھی ہیں، (مقدمہ صحیح مسلم نووی صفحہ ۲۹، و تدریب الراوی، صفحہ ۵۹)

۳۔ قدیم محدثین کے یہاں ایسی تصریحات موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ اس

تفریق کے قائل تھے، اور نہ ضعیف کے معاملہ میں کسی طرح کے تساہل کے روادار تھے، امام مالکؒ عائشہؓ بنت سعدؓ بن ابی وقاص کو ضعیف سمجھ کر ان سے روایت نہیں کرتے تھے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے متعدد تابعین کو پایا مگر ان سے کوئی روایت نہیں کی کیونکہ میرے نزدیک وہ ضعیف تھے، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا قول ہے کہ آدمی کو ضعیف روایتوں کی کتابت میں مشغول رہنا مناسب نہیں۔ (کتاب الکفایہ خطیب۔ صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳)

احمد بن ابی خیثمہؒ نے یحییٰ بن معینؒ سے فلان ضعیف (فلاں ضعیف ہے) کا مطلب پوچھا، تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد نہیں، اور اس سے حدیثیں نہ لکھی جائیں (ایضاً ص ۲۲)

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ کا یہ لکھنا کہ "معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپؐ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو، خلاف تحقیق نہیں، بلکہ یہ قدیم محدثین کی تصریحات کے مطابق ہے، تساہل کا قول متاخرین محدثین کا ہے، جو گو بعض مصالح پر مبنی ہے، مگر اس کا مقصد یہ نہیں کہ فضائل میں ہر قسم کی روایتوں کے نقل و بیان کی گنجائش ہے۔

۴۔ اب رہا مولانا کا یہ اندیشہ کہ اس قدر تشدد سے سیرت اور فضائل اعمال کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا، تو یہی اندیشہ تو احکام و عقائد کے باب میں بھی کیا جا سکتا ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں:۔

"قصہ گویوں، واعظوں اور خطیبوں کو چوکنا رہنا چاہئے، یہ لوگ ایسی بہت سی باتوں کو آپؐ کی ذات گرامی سے منسوب کر دیتے ہیں، جن کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح سے آپؐ کی فضیلت و برتری ثابت کرنے پر انھیں بڑا اجر و ثواب ملے گا، انھیں پتہ نہیں کہ صحیح حدیثوں سے آپؐ کے جو فضائل ثابت ہیں وہ ان جھوٹی اور واہی روایتوں سے مستغنی کر دینے کے لیے کافی ہیں، پھر ان اباطیل سے آپؐ کی فضیلت

ثابت کرنے کی کیا ضرورت؟ یہ تو بڑے گناہ کا موجب اور گمراہی کا باعث ہے، (الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ۔ صفحہ ۲۶)

۵۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بعض ارباب سیر سے قطع نظر عام محدثین نے فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کی حدیثوں میں تساہل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے معجزات کے سلسلہ میں اسکی کوئی صراحت نہیں کی ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ معجزات کا اصل تعلق نبوت سے ہے جو اسلامی عقائد کا ایک اہم جزء ہے، اس اعتبار سے معجزات بھی عقائد ہی کا جزء ہوئے، اس لئے قصہ گوئوں، واعظین اور میلاد خوانوں کی طرح معجزات کو جھوٹ اور عجوبہ کا انبار بنانے سے پرہیز کرنا لازم ہے، اور ان کے باب میں متاخرین محدثین کے تساہل کی رخصت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔

۶۔ معجزات کو آپؐ کے فضل و کمال کی تمامتر بنیاد و دلیل بنانا بھی درست نہیں کیونکہ یہ نہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل ہیں، اور نہ لوازم نبوت میں ہیں، آپ کا فضل و کمال تو ان کے بغیر بھی گوناگوں پہلوؤں سے ثابت ہے، اس بنا پر یہ سمجھنا کہ ضعیف حدیثوں کے ترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں کمی ہو جائے گی، صحیح نہیں ہے،

۷۔ سیرۃ النبیؐ کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس میں صحیح روایتوں کو نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہے، اس طرح ضعیف، موضوع اور غیر صحیح حدیثوں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔

چند اور اعتراضات ا۔ سیرۃ النبیؐ میں صحیح حدیثوں کے التزام کی وجہ سے مولانا بدر عالم کو خیال ہوا کہ اس میں صحیحین کی حدیثوں ہی پر اقتصار کیا گیا ہے، (ترجمان السنہ صفحہ ۸۵، ۸۶) ان کے خیال میں سید صاحبؒ دوسری کتابوں کی حدیثوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، مگر یہ ساری باتیں خلاف واقعہ ہیں، اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے،

۲- مولانا بدر عالم کا یہ اعتراض بھی بجا نہیں ہے کہ سید صاحب کے نزدیک معجزات اور فضائل کی کتابیں صحیح روایات سے خالی ہیں، البتہ وہ حدیث و سیرت کی کتابوں کو وعظ و قصص اور مولود ناموں سے علانیہ ممتاز دیکھنا چاہتے تھے۔

۳- مولانا بدر عالم نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ سید صاحبؒ نے محدثین کبار سے بدگمانی پیدا کی ہے، اور اس کی دو مثالیں دی ہیں کہ انھوں نے حافظ ابن عساکرؒ جیسے شخص کو ضعیف روایتوں کا سرپرست اور حافظ ابن حجرؒ کو کمزور روایتوں کا سہارا اور پشت پناہ کہا ہے، مولانا محدث بھی تھے، اور استاذ حدیث بھی، انھیں خود اندازہ ہوگا کہ محدثین نے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی نقد و جرح میں معاف نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ عباد و زہاد کے متعلق انھوں نے جس طرح کے الفاظ لکھے ہیں، ان کو خوش عقیدہ لوگ سننا بھی گوارا نہ کریں گے، مگر ائمہ فن اور علمائے رجال کی کتابیں اس طرح کے اقوال سے بھری ہوئی ہیں، بلکہ محدثین نے زہد و اتقا میں ممتاز لوگوں کی روایات کی زیادہ تحقیق پر زور دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ عبادت و ریاضت کی کثرت کی وجہ سے روایات کے معاملہ میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے، تمام ائمہ فن نے اس پر زور دیا ہے کہ رواۃ پر بحث و کلام اور نقد و جرح ضروری ہے تاکہ کھرے کھوٹے کا پتہ چل جائے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (موضوعات ملا علی قاری صفحہ ۱۰ و ۱۱)

امام نوویؒ لکھتے ہیں۔

"رواۃ پر جرح جائز ہی نہیں، بالاتفاق واجب ہے، اور شریعت مطہرہ کی حفاظت اور اس کو آلائشوں سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے، اور یہ جرح غیبت نہیں ہے جو حرام ہے، بلکہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہے، امت کے فضلا اور بزرگوں نے ہمیشہ ایسا کیا ہے۔" (شرح نووی ج ۱ صفحہ ۱۲۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رواۃ پر نقد و جرح سے نہ تو محدثین کبار سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے،

اور نہ علمائے فن کے نزدیک یہ کسی کی شان میں بے ادبی اور گستاخی ہے، سیرۃ النبیؐ میں ان روایتوں پر بحث و گفتگو کے وقت جو کتب دلائل میں مذکور ہیں، بلاشبہ راویوں پر نقد و جرح کا ذکر موجود ہے، لیکن ظاہر ہے، اس سے ان کی تنقیص مقصود نہیں، یہ موقع ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے لوگ بھی نقد و جرح سے بچ نہیں سکتے، اسی لئے سید صاحبؒ نے اس بحث کا خاتمہ اس طرح کیا ہے،

"ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبویؐ میں کلام نہیں ہے بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جائے وہ ہر طرح صحیح ہو۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۱۱)

حافظ ابن عساکر کا تاریخ میں پایہ جو بھی ہو لیکن حدیث میں ان کا درجہ علمائے فن کے نزدیک بلند نہیں ہے، امام سیوطیؒ کی کتاب میں اگرچہ معجزات کے متعلق ہر طرح کی روایتیں بھری ہوئی ہیں، لیکن وہ اس کے مقدمہ میں ابن عساکر اور بعض دوسرے محدثین کی کتابوں کے بارہ میں لکھتے ہیں،

"ان کتابوں کے مندرجات ضعیف ہیں، اس لیے ان کا حال بیان کرنا ضروری نہیں ہے، محض ان کی جانب نسبت ہی ان کے ضعف کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔"

(بحوالہ کشف الخطاء و مزیل الالباس۔ ج ۱ ص ۱۰)

رہے حافظ ابن حجر تو وہ مختلف و متضاد روایتوں میں جمع و تطبیق کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں، ایسے موقع پر وہ ضعیف و ناقابل اعتبار روایتوں میں ترجیح سے کام لینے کے بجائے ان کی ایسی تاویل و توجیہ کرتے ہیں جس سے یا تو روایتوں میں تطبیق کی صورت نکل آئے یا ضعیف روایت بھی صحیح قرار پا جائے، ان کے اس رویہ کو عام محدثین نے بھی پسند نہیں کیا ہے، اس لئے ان کی تاویل و توجیہ پر بحث و گفتگو کے وقت سید صاحبؒ کو اس قسم کے اظہار خیال کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

یہاں ہم یہ الزامی جواب نہیں دینا چاہتے کہ خود مصنف اور ان کے حلقہ کے لوگ بھی

حافظ ابن حجرؒ ہی نہیں، امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جیسے اکابر کی شان میں بھی آزادانہ کلمات استعمال کرنے سے باز نہیں آئے ہیں۔

موضوع و ضعیف روایتوں میں عدم امتیاز

مولانا بدر عالم صاحب نے جا بجا یہ بھی فرمایا ہے کہ سید صاحبؒ ضعیف روایتوں کو بھی موضوع، لغو، جھوٹ اور جعلی کہہ دیتے ہیں، اس اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ سید صاحبؒ فن حدیث سے بے بہرہ اور محدثین کی اصطلاحات سے ناواقف تھے، بالفاظ دیگر وہ موضوع اور ضعیف کے فرق سے ناآشنا تھے، حالانکہ سید صاحبؒ نے روایات پر نقد و تحقیق کے ضمن میں جا بجا اس قسم کی عبارتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کے فرق سے بخوبی واقف تھے اور جب وہ کسی حدیث کو موضوع کہتے ہیں تو ان کی مراد موضوع ہوتی ہے، اسی طرح جب کسی روایت کو ضعیف کہتے ہیں تو اس سے انکا مقصود ضعیف ہوتا ہے، مثلاً

"لیکن اس دفتر کا بڑا حصہ موضوع اور جعلی ہے اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور اور ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے وہ بے پہلے گذر چکا ہے۔" (صفحہ ۳۳)

سید صاحبؒ نے جا بجا محدثین کی اصطلاحات پر بحث و گفتگو کر کے ان سے اپنی واقفیت کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے اور محدثین کے اس قاعدہ کا ذکر کیا ہے کہ جو ضعیف روایتیں بکثرت طرق سے مروی ہوتی ہیں، ان کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے، (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۰۸ و ۶۳۶)

اسی طرح سید صاحبؒ نے منکر، منقطع، موقوف، مجہول، غریب، مشہور اور صحیح وغیرہ متعدد طرح کی روایات پر گفتگو کر کے فن کے تعلق سے مختلف مفید، ضروری اور اہم باتیں بیان کی ہیں، اس کے بعد بھی ان کو فن حدیث سے بے بہرہ اور محدثین کی اصطلاح سے ناواقف بتانا عجیب ہے۔

معتزلہ کی تائید

مولانا بدر عالم صاحب نے سید صاحبؒ پر معتزلہ کی تائید اور ہمنوائی کا اعتراض بھی عائد کیا ہے، اس کی تردید کے لیے سید صاحبؒ کا یہ بیان کافی ہوگا۔

امام ابو داؤد نے باب لزوم السنۃ میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ جو یہ ہے:-

"میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے دغرور کی شان سے) بیٹھا ہو، اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے کہ ہم نہیں جانتے جو ہم نے قرآن میں پایا اسی کو مانتے ہیں"

سید صاحبؒ اس کے بارہ میں رقمطراز ہیں:-

"بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں، دور اول میں، اگر یہ پیشین گوئی معتزلہ پر صادق آسکتی تھی، تو آپ آجکل مصر و ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے، جو خود کو اہل القرآن کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔" (جلد ۳ ص ۱۵)

کیا یہ معتزلہ سے سید صاحبؒ کی برأت و بیزاری کا ثبوت نہیں ہے؟

حرف آخر

علمی و تحقیقی اختلاف معیوب نہیں ہے، لیکن مولانا بدر عالم نے سید صاحبؒ جیسے محقق بزرگ کے سلسلہ میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور اس سے جس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے وہ نہایت افسوسناک ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تعلقات علمائے دیوبند سے بہت اچھے تھے، اور انھوں نے ان کے اکابر کا ذکر جس قدر فراخدلی اور احترام سے کیا ہے اور ہر ایک کی وفات پر جس قدر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اسی کی توقع دوسروں سے بھی ان کے بارہ میں تھی، سید صاحبؒ نے جہاں کسی بزرگ سے اختلاف کیا ہے، وہاں متانت اور شائستگی کا دامن ان سے نہیں چھوٹا ہے، بلکہ انھوں نے مراتب شناسی کا پورا لحاظ کیا ہے، لیکن اس کے بالکل ہی برعکس ایک محدث اور استاذ حدیث کا ان کے بارہ میں یہ لب و لہجہ دیکھکر حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔

روس کے ایک ممتاز عالم
قاضی عبدالرشید ابراہیم

از

جناب ثروت صولت صاحب کراچی

(۲)

قاضی عبدالرشید پھر روس میں

اس مدت میں ناممکن ہے کہ قاضی عبدالرشید خاموش بیٹھے رہے ہوں، لیکن سنہ ۱۹۱۶ء کے بعد ان کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں، ہاں مشہور ترک دانشور اور باشقرد حریت پسند زکی ولیدی طوغان کی خود نوشت سے اتنا معلوم ہو سکا ہے، کہ وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں روس میں موجود تھے، کیا کرتے رہے، یہ نہیں معلوم، طوغان لکھتے ہیں۔

"مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں جب کہ شدید برفباری اور طوفان کے دن تھے، ایک دن ایک شخص ہمارے گھر کے دروازے پر آیا، اور کہا کہ میں ماسکو سے آرہا ہوں، یہ صاحب رشید قاضی تھے، جو ترکی میں، ہمارے وطن (روس) اور عالم اسلام میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، ان کا نام عبدالرشید ابراہیم تھا، ان کے

ساتھ دو آدمی اور تھے، جو برف گاڑی میں سمور میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے، یہ ہندوستان کے مولوی برکت اللہؒ اور مولوی عبدالبر تھے، میں نے دونوں کو اندر بلایا، یہ ہندوستانی سردی کی وجہ سے نیم مردہ نظر آرہے تھے، یہ سب چند روز میرے مہمان رہے، یہ ہندوستان کے حریت پسند اور اتحاد اسلام کے علمبردار تھے، اگرچہ ان کا سوشلزم وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن وہ عالم اسلام کو مغربی استعمار سے نجات دلانے کے لیے کمیونسٹوں کے ساتھ تعاون کرنے پر غور کر رہے تھے، یورال کے پہاڑوں میں ایک اسلامی ریاست (باشقردستان) قائم ہونے پر خوش تھے اور اس ریاست کو پورے ترکستان میں قائم ہونے والی ایک عظیم اسلامی ریاست کی ابتدائی شکل تصور کرتے تھے، برکت اللہ کی لینن سے ملاقات ہوئی تھی، اور لینن نے ان کو مجھ سے بات کرنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن یہ لوگ ایک عظیم اسلامی مملکت کی اس پہلی ریاست کی حالت سے بے خبر تھے، ہر ہر بات صاف صاف کہنا بھی ممکن نہیں تھا، لہذا میں نے ان سے کہا کہ یہ سب آپ کی خام خیالی ہے، اسلام اور قرآن کو کمیونزم سے ملانا ایک گناہ ہے آپ چونکہ سوویت رہنماؤں سے بات چیت کر رہے ہیں، اس لئے مذہب کو درمیان میں نہ لائیں، محض ایک سیاسی اور انقلابی تحریک کے طور پر جس طرح چاہیں گفتگو کریں، ان سے بات کرنے کے لیے میں نے اپنے

والد اور چچا کو بھی بلوایا، جو رشید قاضی کے قریبی دوست تھے۔[1]

اس واقعہ کے کچھ دن بعد موسیٰ جار اللہ بھی زکی ولیدی طوغان کے مہمان ہوئے۔ ان کی مہمان داری کا ذکر کرنے کے بعد طوغان لکھتے ہیں کہ

"میں نے رشید قاضی، موسیٰ جار اللہ اور برکت اللہ تینوں کو مشورہ دیا کہ جب بھی ممکن ہو وہ اسلامی ملکوں میں جائیں، لیکن کمیونزم اور اسلام کو ملا کر سوویت رہنماؤں سے نفرت کی شکل میں مدد لینے کا طریقہ اختیار نہ کریں، یہ مشورہ برمحل تھا، چنانچہ تینوں اصحاب نے روس سے جانے کے بعد شکریہ کے ساتھ اس مشورے کا ذکر کیا ہے"۔

طوغان لکھتے ہیں کہ رشید قاضی ۱۹۳۰ء میں ان سے پھر استنبول میں ملے تھے، اور ان کو اپنا ایک رسالہ پیش کیا تھا، جس میں انھوں نے روسی مسلمانوں اور باشقردوں کی پرانی جنگوں کی تاریخ لکھی تھی۔ اس رسالے میں قاضی رشید نے استرلیتمک (Isterlitamak) میں اپنے قیام کا مدح و ثنا کے ساتھ تذکرہ بھی کیا تھا۔

طوغان لکھتے ہیں کہ میں نے استرلی تمک میں ان تینوں حضرات کو ایک ہفتہ مہمان رکھنے کے بعد سرکاری ہوٹ گاڑی کے ذریعے بمقام شفران (Shafran) پہنچا دیا جو قریب ترین ریلوے اسٹیشن تھا۔[2]

برکت اللہ بھوپالی خود بھی ایک بڑے انقلابی تھے اور وہ روسی اشتراکیوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے، قاضی رشید کے ساتھ ان کا باشقردستان آنا ظاہر کرتا ہے کہ شاید قاضی عبدالرشید بھی روسی کمیونسٹوں سے شروع میں امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے، لیکن جب وہ پوری نہ ہوسکیں تو انھوں نے روس چھوڑ دیا۔ قاضی عبدالرشید کی زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس پر تحقیق

---

[1] زکی ولیدی طوغان: خاطرہ لر۔ ص ۳۰۰-۳۰۱ (استنبول ۱۹۶۹ء)، [2] ایضاً

کی ضرورت ہے،

قاضی عبدالرشید ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک کہاں رہے، اس کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ شاید اسی زمانے میں وہ انور پاشا سے ترکستان میں ملے ہوں جو اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ترکستان پہنچ گئے تھے، اور ۵ اگست ۱۹۲۲ء کو اپنی شہادت تک دس ماہ ترکستان میں رہے، عبدالکریم سائیتوہ نے اپنے مضمون میں انور پاشا کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کی جس روایت کا ذکر کیا ہے، وہ واقعہ یا تو اسی زمانے کا ہوسکتا ہے، یا پھر طرابلس کی جنگ کا واقعہ ہوسکتا ہے، جس کے دوران انور پاشا اکتوبر ۱۹۱۱ء سے نومبر ۱۹۱۲ء تک لیبیا میں رہے تھے، ارطغرل دزداغ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرشید طرابلس کی جنگ اور مشرقی ترکستان کی آزادی کی جدوجہد، دونوں میں سرگرم رہے تھے، ۱۹۳۰ء میں وہ استنبول آئے تھے، جیسا کہ طوغان نے لکھا ہے، اور اس موقع پر انھوں نے طوغان کو اپنا رسالہ بھی پیش کیا تھا،

ٹوکیو میں قاضی عبدالرشید کا انتقال ارطغرل دزداغ نے اشرف ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں مکہ میں جاپانی مسلمانوں سے گفتگو کے بعد وہ جاپان میں اسلامی تحریک کو فروغ دینے کے لیے استنبول سے جاپان چلے گئے۔ (ابوبکر موری موتو نے اپنے سفر حج کی روئیداد میں بتایا ہے، کہ ۱۹۰۹ء کے بعد دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک دنیا اور جاپانیوں نے حج کیا تھا۔[1]) جاپان میں انھوں نے جمعیت عظیم ایشیا کی سرگرمیوں کو جاوا، ملایا اور ہندوستان تک بڑھا دیا۔ ان کو اپنی جدوجہد کا یہ صلہ ملا کہ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں ان ملکوں کو آزاد دیکھنے کی ان کو جو توقع تھی اس کی برآری کے آثار ان کی زندگی میں ظاہر ہونے لگے تھے، بالآخر یہ نڈر، بہادر اور ان تھک مجاہد اور عظیم انسان ۳۱ اگست ۱۹۴۴ء کو ۹۴ سال کی عمر میں ٹوکیو میں وفات پا گیا۔[2]

---

[1] اسلامک کلچر فورم، ٹوکیو۔ اپریل ۱۹۷۹ء مضمون کے ترجمہ کے لیے دیکھئے جسارت کراچی ۲۲ جون ۱۹۸۲ء

[2] ارطغرل دزداغ، صفحات تدقیقلری۔ ص ۲۰۰۔

طوغان کی وضاحت کے مطابق وہ انتقال کے وقت ٹوکیو کی مسجد کے امام تھے۔[1]

جاپان کی موجودہ مسجدوں میں پہلی مسجد کا افتتاح ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو شہر کوبے میں ہوا تھا۔ یہ مسجد اوساکا اور کوبے کے مسلمان تاجروں اور ہندوستان، برما، ملایا وغیرہ کے مسلمانوں کی مالی امداد سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے افتتاح کے موقع پر تین سو مسلمان موجود تھے، کوبے کے مئیر اور مصری اور برطانوی قونصل اور متعدد جاپانی عمائدین نے بھی رسم افتتاح میں شرکت کی تھی۔[2]

جاپان کی دوسری مسجد ٹوکیو میں تعمیر ہوئی، اور ۱۲ر مئی ۱۹۳۸ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ یہ مسجد ترک مسلمانوں اور مقامی جاپانیوں کے تعاون سے تعمیر کی گئی تھی، اس کی رسم افتتاح میں یمن کے شہزادے، سعودی سفیر متعینہ لندن جنھیں سلطان ابن سعود نے خاص طور سے بھیجا تھا، مصری نمائندے جسے شاہ مصر نے بھیجا تھا، ٹوکیو کے کئی سو مسلمانوں نے جن کی بڑی تعداد تاتاری تھی اور جاپانیوں کی ایک جماعت نے شرکت کی۔[3]

کوبے اور ٹوکیو کی مسجدوں کی تعمیر اور افتتاح جس زمانے میں ہوا، قاضی عبدالرشید ابراہیم اس ساری مدت میں جاپان میں تھے، لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر نورالحسن برلاس نے مئی ۱۹۳۵ء اور نومبر ۱۹۳۸ء کے درمیان جاپان میں اسلام اور مسجدوں کے افتتاح پر جو مضامین ماہنامہ معارف میں لکھے تھے،[4] ان میں قاضی عبدالرشید کا نام نہیں آتا، ہاں ایک دوسرے تاتاری مسلمان قربان علی کا تذکرہ ضرور ملتا ہے، جو ٹوکیو کی مسجد کے امام بھی تھے، کوبے کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر قاضی عبدالرشید ۷۸ سال کے ہو چکے تھے، اور ٹوکیو کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر ان کی عمر ۸۱ سال

[1] طوغان، در خاطرہ لر ص ۳۰۲ (استنبول ۱۹۶۹ء)۔ [2] جرنل (جدہ)، جلد اول شمارہ اول ۱۹۶۹ء میں عبدالکریم سائیتوہ کا مضمون۔ [3] ایضاً۔ [4] ملاحظہ کیجیے "معارف" اعظم گڑھ، بابت مئی ۱۹۳۵ء، جنوری ۱۹۳۶ء، اور مئی اور نومبر ۱۹۳۸ء۔

کی تھی، ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ عملی سرگرمیوں سے دست بردار ہو چکے ہوں، پروفیسر برلاس کے ان مضامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٹوکیو کی مسجد کی امامت قربان علی کے سپرد تھی۔ اور کوبے کی مسجد کی امامت بھی تاتاری مسلمان کرتے تھے۔ لہٰذا ذکی ولید طوغان کا یہ لکھنا کہ وفات کے وقت قاضی عبدالرشید ٹوکیو کی مسجد کے امام تھے تحقیق طلب مسئلہ ہے، کیونکہ اس وقت ان کی عمر ۹۲ سال ہو چکی تھی، ہاں اس کا امکان ضرور ہے کہ مسجد کے اصل امام قاضی عبدالرشید ہوں لیکن ان کی ضعیفی کی وجہ سے یہ فرض عملاً قربان علی انجام دیتے ہوں۔

تصانیف: ۱۔ قاضی عبدالرشید ابراہیم چھوٹی بڑی کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں سب سے اہم کتاب "عالم اسلام" ہے۔ اس کا پورا نام "عالم اسلام اور جاپان میں اسلام کی اشاعت" ہے۔[1] یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد چھ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد دو سو بیالیس صفحات پر۔ یہ کتاب میں ترکستان، سائبیریا، منگولیا، منچوریا، کوریا، جاپان، چین، سنگاپور، جزائر شرق الہند (انڈونیشیا)، ہندوستان، عرب اور استنبول کی سیاحت سے متعلق ہے۔[2]

۲۔ چولپان یلدزی (ستارۂ زہرہ)، یہ کتاب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۹۵ء میں استنبول سے شائع ہوئی تھی، اس کا موضوع کیا تھا معلوم نہیں۔

۳۔ نوار الحمد:۔ اس نام سے قاضی عبدالرشید نے متعدد رسالے لکھے تھے، اور ان میں روس کے مسلمانوں کو ہجرت کر کے خلافت عثمانیہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی گئی تھی۔

۴۔ باشقردوں اور روسیوں کی جنگوں پر ایک رسالہ جسے ۱۹۳۰ء میں انھوں نے استنبول میں طوغان کو پیش کیا تھا۔

۵۔ طوغان نے اپنی خاطرہ لر کے صفحہ ۱۳۱ پر ترکستان کی آزادی کے موضوع پر ان کی ایک

[1] عالم اسلام وژاپونیاد انتشار اسلامیت (صفحات تدقیقلری ص ۱۹۶)۔ [2] ارطغرل دزداغ، صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹۶۔

اور کتاب کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان لکھی گئی تھی، لیکن اس میں طوغان نے مصنف کا نام عبدالرشید قاضی ابراہیموف لکھا ہے، معلوم نہیں، یہ ہمارے قاضی عبدالرشید ہی ہیں یا کوئی دوسرے صاحب۔

قاضی عبدالرشید ایک صحافی کی حیثیت سے

قاضی عبدالرشید ایک صحافی بھی تھے، اور انھوں نے کازان اور پیٹرزبرگ سے "الفت" اور "تلمیذ" کے نام سے دو اخبار بھی نکالے تھے، ان اخباروں کے علاوہ انھوں نے روس اور ترکی سے نکلنے والے اخبار اور رسالوں میں بکثرت مضامین لکھے، ان اخباروں میں سے کازان کے "بیان الحق" (جو ۳۱ مارچ ۱۹۰۶ء کو جاری ہوا تھا) اور استنبول کے "بصیرت"[1] کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے، بعد میں انھوں نے صراط مستقیم[2] میں بھی باقاعدہ لکھا، اس ہفت روزہ میں ان کے وعظ اور تقریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

سلیمانیہ کے منبر پر

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ عاکف نے اپنے مجموعۂ کلام "صفحات"[3] کی دوسری نظم "سلیمانیہ کے منبر پر" میں قاضی عبدالرشید کو واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور اپنے خیالات کا اظہار ان کی زبان سے کیا ہے، لیکن اس نظم میں عالم اسلام کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ بالکل وہی ہے، جو قاضی عبدالرشید نے اپنی کتاب "عالم اسلام" میں پیش کیا ہے، یہ نظم ۱۵ رمضان المبارک

---

[1] بصیرت اپنے زمانہ میں (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء تا ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) ترکی کا سب سے اچھا اخبار تھا، اور جرمن چانسلر بسمارک نے اس اخبار کو طباعت کی جدید ترین مشینیں فراہم کی تھیں۔ (ترک دیلی و ادبیاتی انسی کلوپیدیاسی جلد اول۔ ص ۳۳۰)

[2] صراط مستقیم بھی اس زمانہ میں سب سے زیادہ چھپنے والا ترکی ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی، (اشرف ادیب کی خودنوشت مطبوعہ ینی آسیا، استنبول۔ ۱۹ جنوری ۱۹۶۹ء)

۲۸ اگست ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء کو مکمل ہوئی تھی، جب کہ کتاب "عالم اسلام" کی پہلی جلد کو شائع ہوئے دو سال ہو چکے تھے، اور عارف ہفت روزہ صراط مستقیم کے شمارہ ۹۰ مؤرخہ یکم جولائی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں اس پر ایک انتہائی اہم کتاب کے زیر عنوان تبصرہ کر چکے تھے، چونکہ اس نظم میں عالم اسلام سے متعلق قاضی عبدالرشید کے مشاہدات کو پیش کیا گیا ہے اس لئے اس کے اقتباسات قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بھی ہوں گے اور قاضی عبدالرشید کے خیالات بھی معلوم ہو سکیں گے، قاضی عبدالرشید کہتے ہیں:-

"مجھ کو منبر پر دیکھ کر آپ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں کوئی وعظ کہنے والا ہوں، میں علماء کے طبقہ سے نہیں ہوں، میری شکل و صورت سے آپ دھوکا نہ کھائیں، دینی احکام کا بیان کرنا فقہا کا کام ہے۔ لیکن اگر آپ عالم اسلام سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہیں تو مجھ سے کر سکتے ہیں، کیونکہ مشرق بعید سے مغرب اقصیٰ تک کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں نے نہ دیکھا ہو، ایشیا، یورپ اور افریقہ میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں میں وہاں گیا ہوں اور ان کے حالات اور ان کے ماضی کے بارے میں تحقیق کی ہے۔"[1]

اس کے بعد قاضی عبدالرشید کہتے ہیں:-

"میں اس سے پہلے بھی استنبول آ چکا ہوں، لیکن یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر پھر روس واپس چلا گیا تھا۔" اس کے بعد قاضی عبدالرشید روس کے مسلمانوں کی تباہ حالی کا ذکر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مہذب یورپ کو حکومت روس کے مظالم دکھائی نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو جگانے کے لئے ایک خفیہ چھاپہ خانہ قائم کیا تھا، اور پندرہ بے سہارا لوگوں کو تلاش کر کے فن طباعت سکھایا۔

---

[1] محمد عاکف ارصوے: صفحات۔ ص ۱۶۱ (استنبول ۱۹۴۴ء)

اس کے بعد ایک اخبار نکالا، مسلمانوں کو متحد ہونے اور تعلیم کو فروغ دینے کی تلقین کی، جس کے نتیجے میں دولت مند آگے آئے اور مدرسے قائم کئے۔ قاضی رشید کہتے ہیں کہ ہم اس محنت سے کام کر رہے تھے کہ ایک دن انکے چھاپا خانہ پر چھاپا مارا جاتا ہے، اور وہ ترکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ تاشقند، بخارا، سمرقند اور بےشمار مقامات پر جاتے ہیں، یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"ان لوگوں کے مذہبی تعصبات کو نہ پوچھو کہ وہ بہت مضحکہ انگیز ہیں، وہ خواجہ (مولوی) جس کے خرقے کی آستین اور دامن زمین پر گھسٹ رہے ہیں، وہی حد مذہبی تجاوز کرنے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ ملت کے فائدے کے لئے تم جو کچھ بھی سوچو اس کی نظر میں بدعت ہے، مگر شریعت کو بدل دینا اور ذلیل کرنا اس کی نگاہ میں سنت ہے۔"

یہاں کثیر التعداد شعراء موجود ہیں، جن کا موضوع عورت ہے، اور یہ لوگ اس داستان حسن و عشق کو تصوف کہتے ہیں، مگر اس خطے کے نوجوان بیدار ہو رہے ہیں، ایک دن ان کی کوشش بار آور ہوگی۔"[1]

ترکستان سے عبدالرشید چین اور منچوریا جاتے ہیں، چین کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:۔ یہاں کے مسلمانوں کے نزدیک مذہب جامد روایات کا دوسرا نام ہے، مسلمان آبادی جاہل اور پسماندہ ہے۔

ہمارا سیاح اس کے بعد جاپان جاتا ہے، اور جاپانیوں کے بارے میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار کرتا ہے:۔

---

[1] محمد عاکف:۔ صفحات۔ ص ۱۴۷ - ۱۶۹ - اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد صابر کا ہے اور علی نہاد تارلان کی کتاب محمد عاکف سے لیا گیا ہے، دیکھئے کتاب مذکور کا صفحہ ۶۹ - ۷۰۔

"چھوٹے قد کے آدمیوں کی یہ عظیم قوم اسلام کے تمام اصولوں کی پیروی کرتی ہے، وہ صرف توحید پر یقین نہیں رکھتے، لیکن ایمانداری، وفاشعاری، رحم، قناعت، فیاضی، مکمل ضبط و نظم اور ملک کی بھلائی کے لئے قربان کرنے پر آمادہ رہنا، یہ تمام باتیں اسلامی تعلیمات کا جزو ہیں، اور اہل جاپان میں پائی جاتی ہیں، جاپان نے مغربی سائنس کو اپنایا مگر اس کے مضر اثرات سے اجتناب کیا۔ ضابطۂ اخلاق کی جتنی پابندی جاپانی کرتے ہیں، ان کا مسلمانوں میں دور دور پتہ نہیں۔"[2]

قاضی عبد الرشید کا خیال تھا کہ جاپان میں اسلام آسانی سے پھیل سکتا ہے، صرف خلافت عثمانیہ کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی مقصد سے انھوں نے سلطان عبد الحمید سے مدد طلب کی تھی۔

قاضی عبد الرشید ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

ہندوستان کا سفر

"میں ہندوستان کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں جہاں جاتا تھا، پولیس میرے تعاقب میں وہاں تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے میری طاقت جواب دے گئی۔ اور میں اپنی آرزو پوری نہ کر سکا۔ پھر بھی میں نے وہاں پر حظ کا تھوڑا بہت لطف اٹھایا، یہاں میں نے مسلمانوں میں دینی روح پائی، وہ قرآن کی حکمت کو سمجھتے ہیں، ان کے علماء ایسے ہیں، جن کے آگے اہل مغرب سر جھکائیں۔ نوجوانوں میں بھی یہی جذبہ ہے، جو لوگ تعلیم حاصل کرنے انگلستان جاتے ہیں۔ وہ بندر کی طرح مغرب کی اندھی تقلید نہیں کرتے، یہاں بے حیائی نہیں، لوگ شراب نہیں پیتے، عالی ہمت ہیں، اور ان میں شریعت کا احترام ہم سے زیادہ ہے۔

---

[2] ڈاکٹر علی نہاد تارلان:۔ محمد عاکف (اردو ترجمہ) ص ۱۰، نیز محمد عاکف۔ صفحات ۱۷۰

[3] ازطرل وزداغ:۔ صفات تذقیقلری۔ ص ۱۸۱

افسوس وہ عنصر ایمانی جو لائق ستائش ہے، ہم میں نہیں ہے، ہند کے مسلمانوں کو ترکوں پر قیاس نہ کرو، ان کے جسموں میں روح شجاعت سے جوش مارنے والا خون موجود ہے، ہم میں ان کے جیب خلوص حمیت اور جذبۂ دینی نہیں ہے۔[۱]

قاضی عبدالرشید جب حیدرآباد (دکن) پہنچتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان نے آخر کار سلطنت عثمانیہ میں آئین بحال کر دیا ہے، وہ بڑی توقعات اور جوش کے ساتھ استنبول آئے ہیں، مگر یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں، وہ جب استنبول کے ساحل پر قدم رکھتے ہیں تو یہ دیکھکر حیرت میں رہ جاتے ہیں، کہ ملک انتشار کا شکار ہے، اور حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔:

"جب میں استنبول آیا تو میں نے دیکھا کہ ہر کوچہ و بازار نعروں سے تلاطم میں ہے۔

ہاں ایسا کیوں نہ ہو آزادی جو مل گئی ہے، لوگ سچ کہتے ہیں، کہ جب جوش و خروش میں ہیجان آجاتا ہے، تو عقل اور سمجھ رخصت ہو جاتی ہے، میں نے اس دن ہر شخص کو عقل سے بیگانہ دیکھا۔[۲]

صفحات کے مندرجۂ بالا اقتباسات قاضی عبدالرشید ابراہیم کی زندگی اور ان کے افکار پر اچھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں، اگر ان کی کتاب "عالم اسلام" دستیاب ہوتی تو ہم اس سے مزید اقتباسات پیش کرتے تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ انھوں نے مختلف ملکوں میں اور کیا دیکھا، اتفاق سے ارطغرل وزداغ نے اپنی کتاب صفحات تدقیقلری میں عالم اسلام سے چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم انھیں ذیل میں پیش کرتے ہیں چین سے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

[۱] محمد عاکف :۔ صفحات۔ ص ۱۷۱ - ۱۷۳ (استنبول ۱۹۴۴ء) [۲] علی نہاد تارلان :۔ محمد عاکف (اردو ترجمہ) ص ۴۳ (لاہور ۱۹۷۰ء)

چین عام طور پر چین کی مسجدوں میں نماز سے پہلے طلبہ ایک حلقہ بنا کر سورۂ کہف پڑھتے ہیں اس مرتبہ بھی جب ہم مسجد میں آئے تو سورۂ کہف پڑھی جا رہی تھی، محمد حنیف آفندی پہلی مرتبہ چین کی کسی مسجد میں آئے تھے، وہ پہلے تو حیرت سے دیکھتے رہے، پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، میں نے بتایا کہ سورۂ کہف پڑھ رہے ہیں کہنے لگے میرے دوست مجھے پوری سورۂ کہف زبانی یاد ہے لیکن یہ لوگ جو پڑھ رہے ہیں، اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔"
(عالم اسلام۔ جلد اول۔ ص ۵۴۷)[۱]

میں بھی محراب کے پاس ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ شور کی آواز بلند ہوئی۔ میں فوراً دروازے کی طرف لپکا۔ دیکھا کہ لوگ ناقوس بجا رہے ہیں، ان لوگوں کے ناقوس عیسائیوں کے ناقوسوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بودھ مت کی عبادت گاہوں میں جو ڈھول بجائے جاتے ہیں ان سے مشابہ ہیں، یہ ڈھول مسجد کے دروازے کے سامنے رکھے ہوتے ہیں، لوگ مسجد میں آتے وقت اس کو بجاتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ اس طرح ان کو ثواب ملے گا۔"
عالم اسلام جلد دوم۔ ص ۵۰۶)[۲]

جاپان جہاں تک عیسائی مبلغوں کا تعلق ہے، وہ دنیا کے ہر حصے میں دن رات جدوجہد کر رہے ہیں۔ چین میں بھی ہر طرف حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، یہ مبلغ پہاڑوں میں، وادیوں میں میدانوں میں ہر جگہ نظر آئیں گے، جہاں کہیں خلا پاتے ہیں وہیں اپنا گھونسلا بنا لیتے ہیں، چین میں ان لوگوں نے جس کثرت سے خانقاہیں بنائی ہیں، دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوں گی، یہ لوگ اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ ڈالتے ہیں حتیٰ کہ جان لینے سے بھی باز نہیں آتے، ایک دن چینی لوگوں کو نکال باہر کریں گے اور اس کے لیے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی (جلد اول ص ۵۵۲)[۳]

ہندوستان مسیحیت کے یہ خادم بہ حشرات الارض دنیا کے ہر حصہ کی طرح ہندوستان میں بھی کثرت سے

[۱] ارطغرل وزداغ :۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۸۱ [۲] ایضاً ص ۱۸۱ [۳] ایضاً ص ۱۸۱

موجود ہیں، ہندوستان میں کسی جگہ کسی قسم کا اجتماع ہو، یہ مسیحی مبلغ وہاں پہنچ جاتے ہیں، اور اپنی دوکان لگا لیتے ہیں، تین چار فرنگی خواتین بناؤ سنگھار کر کے آ بیٹھتی ہیں اور عیسائیت کو نیلام کرنا شروع کر دیتی ہیں، اور ہندو اور مسلمان دونوں کو عیسائیت کی دعوت دیتی ہیں، معلوم نہیں ان اجتماعات میں خواتین کو کیوں لایا جاتا ہے۔ (عالم اسلام جلد دوم۔ ص ۱۱۸[1])

ایک دن ایک گھر میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک دوکان تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، سامنے بیشمار لوگ جمع تھے، اُس دوکان کے اندر دو نوجوان خواتین بناؤ سنگھار کیے موجود تھیں، اور باہر دو مسیحی مبلغ اردو زبان میں مسلمان حاجیوں کو خطاب کر کے حج اور دوسرے اسلامی دینی امور کے خلاف بدزبانی کر رہے تھے۔" (عالم اسلام جلد دوم۔ ص ۱۱۰[2])

میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر ممبئی جانے کے لئے ٹرین پر سوار ہو گیا۔ ایک جگہ میرے پاس ایک پولیس افسر آیا۔ اور مجھ سے دوسرے ڈبے میں جانے کے لیے کہا، لیکن میں نے اپنی جگہ چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک انگریز افسر آیا۔ اس نے بھی مجھ سے کچھ کہا جس کی میں نے پرواہ نہ کی۔ آخر میں میرے ڈبے میں ایک مسیحی مبلغ آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا، میں نے محسوس کیا کہ وہ سول پولیس سے تعلق رکھتا ہے، میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور کتاب پڑھنے میں مصروف رہا۔ جب ممبئی آیا تو یہ شخص سو رہا تھا، میں فوراً گاڑی سے اترا اور اپنے راستے پر روانہ ہو گیا، میں بڑی سڑک سے مسلمانوں کے محلے کی طرف جا رہا تھا کہ وہ شخص بھاگتا ہوا میرے پیچھے آنے لگا، سڑک سنسان تھی، اور قریب تھا کہ وہ مجھے پکڑ لے، میں نے اس کو ایک گھونسہ رسید کیا، پھر دو تین گھونسے اور لگائے، اس کے بعد وہ سیٹی بجاتا ہوا بھاگ گیا۔" (عالم اسلام جلد ۲ ص ۱۱۱[3])

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم قاضی عبدالرشید کی مذکورہ بالا کتاب سے ایک اور اقتباس

[1] ارطغرل دزداغ: صفحات تدقیقلری ص ۱۸۱-۱۸۲ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] ایضاً ص ۱۸۳

دینا چاہتے ہیں، جس میں انھوں نے علماء کو مخاطب کر کے ان کا فرض یاد دلایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"خود کو ہم انبیاء کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اگر ہم اوپر سے نیچے تک اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کیا چاہتے ہیں، اور کیا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ ہم کس حال میں مبتلا ہوگئے ہیں، دوسروں کو اسلام کی دعوت دینا ایک طرف رہا۔ نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنا، ذرا ذرا سی بات پر مسلمان بھائیوں کو کافر قرار دینا ہمارے علماء کا کام رہ گیا ہے، آج ہمارے بہت سے علماء کا دین و ایمان پیسہ ہو گیا ہے، دین کی خاطر خود کو قربان کرنے کے بجائے شریعت کو اپنی بداعمالیوں اور نفس امارہ کا آلۂ کار بنا لیا ہے۔" (عالم اسلام جلد اول ص ۵۹۸[1])

قاضی عبدالرشید پر مزید تحقیق کی ضرورت

قاضی عبدالرشید ابراہیم کے یہ مختصر حالات ان کی عظمت اور ان کے کارناموں کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان پر تحقیق کیجائے تاکہ ان کے مفصل حالات اور کارنامے سامنے آسکیں، اور وہ تشنگی دور ہو سکے جو اس مختصر مضمون کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے، انھوں نے روس میں جو مدرسے قائم کئے ان کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اسی طرح سینٹ پیٹرس برگ میں انھوں نے چھاپہ خانہ قائم کر کے جو مطبوعات شائع کیں، ان کے ہم کو نام تک معلوم نہیں۔ ان کے نکالے ہوئے اخبارات الفت اور تلمیذ کے بارے میں بھی ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں۔

روسی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں زار کے دور میں اور اس کے بعد اشتراکی دور میں انھوں نے جو سیاسی خدمات انجام دیں، ان کے بارے میں بھی ہم تاریکی میں ہیں، اتحادِ اسلام، خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔

[1] ارطغرل دزداغ۔ صفحات تدقیقلری ص ۱۸۲

اس کا تفصیلی تعارف ضروری ہے، دار الحرب سے ہجرت کرکے دار الاسلام میں آنا اسلامی شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے، برصغیر پاکستان و ہند میں تحریک آزادی کے زمانہ میں ایسی ایک تحریک چل چکی ہے۔ جدید تاریخ میں اس کی پہلی مثال شاید قاضی عبدالرشید نے قائم کی، اور روسی مسلمانوں کو ہجرت کرکے دولت عثمانیہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی، اس تحریک کا بھی پورا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان کی سیاحت کی تفصیلات پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ایک سیاح کی حیثیت سے بھی ان کا مقام کافی بلند ہے۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے قاضی عبدالرشید کی تمام تصانیف کی بالعموم اور "عالم اسلام" کی بالخصوص از سر نو اشاعت ضروری ہے۔ روزنامہ "بصیرت" استنبول اور ہفتہ روزہ "صراط مستقیم" استنبول کی فائلیں ترکی میں موجود ہیں، ان کی مدد سے ان میں شائع ہونے والے مضامین بھی جمع کئے جا سکتے ہیں، اور قاضی عبدالرشید کے حالات بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں، اسی طرح روس سے ترکی زبان میں نکلنے والے اخبارات اور رسالوں کی پچھلی فائلوں سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے، جو شاید روس اور ترکی کے کتب خانوں میں موجود ہوں۔

دولت عثمانیہ

مسلمانوں کی قابل فخر شاندار سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی مفصل تاریخ، اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل، جلد اول بانی سلطنت عثمانیہ عثمان اول ۱۲۹۹ء سے مصطفی رابع ۱۸۰۸ء تک جلد دوم۔ محمود ثانی ۱۲۲۳ھ سے تا جنگ عظیم ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۹ء تک کی تاریخ ان ہی دونوں جلدوں میں اس سلطنت کی پوری تاریخ آگئی ہے، جس سے صدیوں تک ہندوستان مسلمانوں کا بڑا تعلق رہا ہے، اور وہ اس کی مصیبتوں میں برابر دامے درمے، قدمے مدد بھی کرتے رہے۔

از۔ ڈاکٹر محمد عزیر ایم، اے، ایل، ایل بی، پی، ایچ ڈی، سابق رفیق دار المصنفین۔

قیمت۔ علی الترتیب ۳۰، ۳۰ روپیے

مکتوب مدینہ منورہ

محمد علی اکاڈمی، مدینہ منورہ،

۴ ذی الحجہ۔ ۱۴۰۶ھ

یا حضرت المکرم ذو المجد و الکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ایک سفر پر تھا، واپس آیا، تو گرامی نامہ نظر افروز ہوا، میرے لیے فخر و ناز کی بات ہے، کہ ایک چھوٹی سی نیکی آپ کے ہاں اتنی عظیم بن گئی، بے شک مدینہ کا ذرہ ذرہ عظیم ہے، کاش ہمیں قدر دانی نصیب ہو، مکتوب گرامی اس وقت سامنے نہیں ہے، بہت دن سے ارادہ کر رہا تھا، جواب نہیں لکھ سکا، اس وقت مسجد میں (بین المغرب والعشاء) وقت مل گیا، غنیمت سمجھا کہ دو سطریں ہی لکھ دوں، آپ تو انتظار کرتے کرتے کبھی کے مایوس ہو گئے ہوں گے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ میں ۱۹۲۶ء میں معارف کا خریدار ہوا تھا، جی چاہتا ہے، کہ ساٹھ برس کے بعد ۱۹۸۶ء میں بھی خریدار ہو جاؤں، یہ آپ کے معارف کی تاریخ میں بھی شاید انوکھی بات ہوگی، مگر میں چاہتا ضرور ہوں، قیمت کس طرح روانہ کروں، ؟ والسلام

میری پیدائش اکتوبر ۱۹۱۲ء کی ہے، اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ۱۴ سال کا ہوا، ۱۹۲۶ء میں چودھواں شروع ہوا تھا، ابا جان قدس سرہٗ خوش نویس تھے ہی، مجھے کتابت پر ڈالا، ۱۹۲۵ء کے آخر میں ہم کاتب ہو گئے، جو پہلا کام کیا اس کی اجرت چھ روپیے ملی، رسائل و جرائد کا بہت شوق تھا، دن رات یہی مشغلہ تھا، ابا جان نے بھی یہ شوق دیکھ کر ہماری اس پہلی

مزدوری سے رسالہ معارف جاری کرادیا۔

عید کا دن تھا، صبح کا وقت، ڈاک آچکی تھی، میں اخبارات دیکھنے میں مشغول تھا، بلکہ منہمک تھا، میرے کتابت کے استاد اللہ بخشے منشی علی حسن تاب نہ لاسکے، فرمایا یہ کیسا بچہ ہے، عید کا دن ہے اور یہ اخباروں میں پڑا ہوا ہے۔ استاذ گرامی مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی نے اور زیادہ غصہ سے فرمایا، یہ بچہ نہیں بادا آدم ہے، (یہ سب اخبار مدینہ بجنور کے دفتر کی باتیں ہیں)

یہ معارف ہمارے لیے کیوں جاری ہوا، حضرت والد صاحب قدس سرہ مولانا شبلیؒ کے قلم کے قائل تھے اسی لیے ہمیں الفاروق سبقاً سبقاً پڑھائی تھی، پھر سیرۃ النبیؐ شروع کرائی، مولانا شبلیؒ کے بعد سید صاحبؒ ہی ان کے جانشین تھے، وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے قلم کو اپناؤں، یوں اس زمانہ میں ہمایوں (لاہور) ایک اچھا سنجیدہ رسالہ تھا، الناظر بھی تھا، زمانہ بھی تھا، مگر ان کے نزدیک سب سے مرجح معارف ہی تھا۔

الشئی بالشئی یذکر، ہم اپنی کتابت کے ساتھ جامعہ ملیہ میں داخل ہوئے، فیس کا ایک حصہ اس کی اجرت سے ادا ہوتا تھا، مولائے کل مولائے تحریکِ خلافت مولانا محمد علیؒ کی خدمت میں ڈاکٹر ذاکر صاحب نے پیش کیا، دو باتیں فرمائیں۔

۱۔ یہ مراد آباد کے رہنے والے ہیں اور

۲۔ اپنی فیس اپنی مزدوری سے ادا کرتے ہیں۔

دوسری بات پر تو کچھ نہیں فرمایا، پہلی پر یہ کہہ کر چمٹا لیا، یہ تو میرا ہم وطن ہے، مگر جب خود شوکت صاحب سے تعارف کرایا تو یہ فرماتے ہوئے۔

یہ جامعہ میں سلف ہلپ (selfhelp) کی مثال ہے، اور پھر شاید اسی بنا پر اپنی خط کتابت کے لیے میرا انتخاب فرمایا خاص طور پر، مبئی میں تھے وہاں ذاکر صاحب سے فرمایا

میرے لیے ذاکر صاحب نے میرے نہایت محبوب استاد سعید انصاری صاحب کو لکھا کہ عبدالملک کو تعطیلات میں، (جون، جولائی) گھر نہ جانے دو مولانا اس کو چاہتے ہیں، وہ اپنے والد کی اجازت منگالے، مگر یہی جون جولائی مولانا محمد علیؒ کی بیماری کی شدت کا زمانہ ہے، جب وہ شملہ تشریف لے گئے، یوں عملی طور پر ایک سطر لکھنے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔

مگر میں بفضلہ تعالے واحد شخص تھا، جو اس وقت ان سے قریب تھا، جامعہ ان سے چھوٹ چکی تھی، ذاکر صاحب کا اخلاقی کمال تھا کہ وہ پھر بھی پوری نیازمندی کے ساتھ حاضری دیتے تھے، اگرچہ مولانا کو ایک دفعہ لکھنا پڑا "ذاکر! کیا تم بھی میری طرف سے بدگمان ہو" واحد شخص ہونے کی بنا پر ہی میں اپنے آپ کو "مولانا کا آخری آدمی" کہا کرتا ہوں، اگست سنہ ۲۹ء سے لے کر ۵ مئی سنہ ۳۰ء تک کا زمانہ صرف میرا زمانہ ہے، اس زمانہ کے حالات میرے سوا کوئی نہیں جانتا، الا ماشاءاللہ۔

میں ذاکر صاحب کی سیاسی روش سے راضی نہیں تھا، ایک موقعہ پر لکھ دیا۔ "جامعہ: اول پر سیاست کا بھوت جب سوار ہوتا ہے تو مذہبیت پیچھے رہ جاتی ہے"، ذاکر صاحب کو خبر ہوئی، بہ نفس نفیس بورڈنگ تشریف لائے، مجھے باہر بلایا، اور سڑک پر ٹہلتے ہوئے فرمایا "تم تو یہ کہتے ہو، اور میں روتا ہوں کہ یہاں مذہب ہے نہ سیاست"!

جامعہ میں اپوزیشن صرف میری ذات سے ہی تھی، گاندھی جی کی نمک سازی کی مارچ پر جلسہ ہوا، مجھے خبر نہیں تھی، تلاش کر کے بلوایا گیا، تقریر کرائی گئی، اور پھر ذاکر صاحب نے اس کا جواب دیا، اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ "انگریز کا جانا تو اب طے ہو گیا ہے، مسلمان نہیں چاہتے تو اس کی ٹانگیں پکڑ کر لٹک جائیں"، میں ایک دن مولانا کے پاس ایسے وقت پہنچا، کہ ذاکر صاحب بھی وہاں موجود تھے، مولانا نے فرمایا، یہ ملک کی سیاست میں ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں۔

آپ کسی وقت ان سے گفتگو فرمائیں، مولانا نے فرمایا ہاں ہاں میں ضرور باتیں کروں گا، مولانا پر میرا حال خوب روشن تھا۔

حکایت کتنی دراز ہوگئی، "لذیذ بود" والی بات ہے، خط کتابت والی بات تو اب ختم ہوگئی تھی کہ گھر میں بی گلنار کی شادی کی وجہ سے ٹھہرا رہا، ہمارے ہی ہوسٹل میں اس کا نظم تھا، لڑکے سب جا چکے تھے، ہوسٹل سارا خالی تھا، وہاں زاہد علی صاحب سے ملایا، فرمایا "یہ ہماری شادی کے منتظم ہیں"۔ یہ بڑے لوگ کیا ہوتے ہیں، کس طرح چھوٹوں کو بڑا بناتے ہیں، حالانکہ میرا انتظام سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور نہ ہوسکتا تھا، کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، برائے نام بھی تو تعلق نہیں تھا، مگر یہ اعزاز ملنا تھا ملا۔

ڈاکٹر انصاری سمدھی بن کر آئے تھے، شیعب صاحب کو دولھا بنا کر لائے تھے، قلاقند کی پلیٹیں، سچی چینی کی تقسیم کی گئی تھیں، اسی دن ایک قصہ بھی پیش آگیا تھا، مگر قصے کہاں تک بیان کروں، یہ تو الف لیلہ بن جائے گی۔

انصاری صاحب کو مولانا سے بے حد محبت تھی، حد سے زیادہ، راہ جدا ہوگئی تھی مجبور تھے، محبت کا اظہار کب ہوا، مولانا کی وفات، نہیں بلکہ شوکت صاحب کی واپسی پر (تدفین بیت المقدس کے بعد)، جامع مسجد میں جلسہ ہوا، ڈاکٹر صاحب کو آنا ہی تھا، اللہ اللہ وہ جب مسجد میں داخل ہوئے ہیں، میں نے کسی آدمی کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے نہیں دیکھا، جس طرح وہ دھاڑیں مار رہے تھے، لوگوں نے دونوں جانب سے بمشکل ان کو پکڑ رکھا تھا، پھر اس کے بعد شوکت صاحب سے مل کر ان کا رونا۔

میں ایک قلمی رسالہ نکالا کرتا تھا، اس کا محمد علی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا، ڈاکٹر صاحب سے مضمون کی درخواست کی، زخم تازہ ہوگیا، کہنے لگے "مجھے بڑا رنج ہے، جامعہ والوں نے

محمد علی کو بڑی جلدی بھلا دیا"، بھلا نا کیا، انھوں نے یاد رکھنے کا ارادہ بھی کب کیا تھا، سیرت محمد علی (از استاذی رئیس احمد جعفری) کی بھی ایک حکایت ہے، یہ دفع الوقتی کے لیے تیار کی گئی تھی، اصلی پلان یہ تھا، کہ بہت ضخیم کتاب لکھی ہے، اس کے ابواب تقسیم ہوئے تھے،

(۱) شعیب قریشی (۲) عبدالرحمٰن صدیقی (۳) ڈاکٹر انصاری (۴) ڈاکٹر ذاکر حسین (۵) مولانا شوکت علی (۶) مولانا دریابادی (۷) قاضی عبدالغفار وغیرہم پر،

پھر یکایک خیال بدل گیا۔ مجھے خبر ہوئی، روتا ہوا ذاکر صاحب کے پاس گیا۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ کیوں ملتوی کر دیا۔ فرمایا۔

مولانا پر صحیح اور سچی بات لکھنی ہے، تو وہ ۲۵ برس سے پہلے نہیں لکھی جاسکتی، جب تک ان کے معاصرین زندہ ہیں، زبان بند رکھنی پڑے گی، اس کے بعد کتاب کا وقت آئے گا۔

میں نے کہا تو اس وقت تک اس کے چاہنے والے بھی ختم ہوجائیں گے۔ اور جذبات بھی ختم ہوجائیں گے، سو ایسا ہی ہوا۔

خط تو مسجد میں لکھا جا چکا تھا، اب تین دن میں اس کا حاشیہ ہوا ہے۔

محمد عبدالملک

مطبوعاتِ جدیدہ

تذکرہ صوفیائے میوات :- مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۰۰، مجلد، قیمت ایک سو پچاس روپیے، پتہ میوات اکیڈمی، متصل جامع مسجد، گھاسیڑہ، ضلع گوڑگاؤں، میوات،

یہ میوات کے ان صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جن کے فیضان اور نفس گرم سے میو قوم کی خاکستر میں ایمانی حرارت کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اور ایک ہزار برس سے یہ علاقہ نور ایمان سے جگمگا رہا ہے، اس کے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں میو قوم کی قدامت وعظمت، اس کی موجودہ پس ماندگی وزبوں حالی اور اس کا تاریخی وجغرافیائی پس منظر بیان کیا ہے۔ میو قوم کے نسب، وسط ایشیا سے اس کے ہندوستان آکر مختلف جگہوں میں آباد ہونے اسکی نمایاں خصوصیات اور میوات کے امتیازات وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر میو قوم کے قبولِ اسلام کی عہد بعہد سرگذشت بیان کی گئی ہے، جس سے اُن لوگوں کے مجاہدانہ کارناموں اور دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جن کی بدولت یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور یہ علاقہ مسلمانوں کے زیرنگیں آیا، اس کے بعد مصنف نے ان سرچشموں اور رشد وہدایت کے مرکزوں کا ذکر کیا ہے، جن کی وجہ سے ان کے خیال میں اسلام کی حفاظت وپاسبانی ہوئی اور یہاں اسلام کا چراغ گل نہ ہونے پایا، انھوں نے اسلام کے تحفظ وبقا کے ضامن مرکزوں میں پہلے مدارس وخانقاہوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں جہاں ان مدارس اور خانقاہوں کے

بارہ میں معلومات تحریر کئے ہیں، وہاں ان مقامات کے بارہ میں بھی مفید باتیں قلمبند کی ہیں، جن میں مدارس اور خانقاہیں قائم تھیں، اور آخر میں ان صوفیہ ومشائخ اور علما وفقہا کے حالات اور کارنامے بیان کیے ہیں، جن کی اصلاحی، دعوتی اور دینی سرگرمیوں کا یہ علاقہ محور رہا، اس سلسلہ کا آغاز حضرت بیرزطنؒ اور حضرت سید سالار مسعود غازیؒ وغیرہ کے تذکرہ سے ہوا ہے، پھر تصوف کے سلاسل چشتیہ، مداریہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے ان عارفین کا تذکرہ ہے جن سے میو قوم کو فیض پہنچا، ایک حصہ میوات کے علما وفقہا کے ذکر کے لئے مخصوص ہے، اس میں ان کے حالات اور فقہی وعلمی خدمات درج ہیں، یہ کتاب محنت وجستجو سے مرتب کی گئی ہے، ابھی تک اس موضوع پر اتنی وسعت سے نہیں لکھا گیا تھا، اور یہ صرف میوات کے صوفیائے کرام ہی کا تذکرہ نہیں ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ میو قوم اور میوات کی مختصر تاریخ اور یہاں کے مدارس اور خانقاہوں کا اجمالی خاکہ بھی ہے، مصنف نے اس کا دائرہ وسیع کر دیا ہے، اور اس میں خاص میوات اور میو قوم ہی کے مدارس، خانقاہوں اور صوفیہ کرام کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اُن سب کا ذکر بھی کیا ہے جن سے میو قوم کے لوگوں کو فیوض پہنچے مگر تذکرہ میں اہل میوات یا میو قوم سے صاحب تذکرہ کے تعلق اور ربط وغیرہ کی صراحت بھی کرنے کی ضرورت تھی، کہیں کہیں طوالت وتکرار بھی ہے، مثلاً خانقاہوں اور تصوف کی اہمیت اور ان کے مخالفین کی تردید متعدد جگہ کی گئی ہے جو غیر ضروری ہے، ایک جگہ بہرائچ کو ضلع سلطان پور کا حصہ لکھا ہے، (صفحہ ۱۸۰) بہرائچ تو خود ضلع ہے، کہیں کہیں کتابت وطباعت کی غلطیاں بھی ہیں، جیسے خانقاہ کا املا خانقہ (۳۳) مذاق کا مزاق (۳۸۳) لکھا ہے، ایک جگہ فیح کو مذکر لکھا ہے، (۶۰)

جدید مدیکل مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں :- از مولانا برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت اٹھ روپے، پتے (۱) مجلس تحقیقات اسلامی متصل مسجد احاطہ شاہ سعید آباد، حیدرآباد (۲) مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار (۳) مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ،

مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر وحدیث وناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء نے موجودہ زمانہ کے مسائل کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنایا ہے، اور وہ ان کا اسلامی حل تلاش کرنے کے لیے فکرمند بھی رہتے ہیں، ان کی اسلامی فقہ پر اچھی نظر ہے، اور وہ فقہی مسائل پر برابر مضامین لکھتے ہیں، مجلس تحقیقات اسلامی حیدرآباد نے اس نوعیت کے ان کے مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، جس میں مندرجۂ ذیل نئے مسائل پر اسلامی شریعت کی روشنی میں بحث وگفتگو کی گئی ہے، ضبط تولید اور اس کے مختلف رائج طریقے، ٹسٹ ٹیوب سے تولید، اعضا کی پیوندکاری، پوسٹ مارٹم، دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال، انسانی خون اور انسانی دودھ کی خرید وفروخت، لاعلاج مریضوں کے لیے مہلک ادویہ، الکوحل کی مخلوط ادویہ، جانوروں کے جسم پر میڈیکل تجربات، پلاسٹک سرجری وغیرہ، فاضل مصنف نے ان مسائل کا تجزیہ وتنقیح کرکے ان کا واضح حکم بیان کیا ہے، گو بعض امور میں اس دور کے دوسرے فضلا کی رائیں ان کی رائے سے مختلف ہیں، نیز ناشر کے بقول "حالات وضروریات کے اقتضا سے بعض مسائل میں مزید توسع سے کام لینا چاہئے تھا"، تاہم مولانا نے ہر مسئلہ پر محقق ومدلل بحث کی ہے، اس لیے ان کی رائے میں بھی وزن واعتدال ہے، اس مجموعہ سے ان لوگوں کو بڑی مدد ملے گی جو ان مسائل پر غور وفکر کرتے ہیں۔

ذکر رسول } از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، مرتبہ جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی،
مردوں کی مسیحائی } متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۶ مجلد مع حسین گردپوش، قیمت ۲۰ روپے، ناشر ادارۂ انشائے ماجدی، ۱-۴/۴ راجندر سرائی کلکتہ ۱۳۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے مضامین کا ایک مجموعہ سیرت واسوۂ رسول کے موضوع پر "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے بہت عرصہ قبل چھپا تھا، اب یہ دوبارہ کسی قدر ردوبدل کے بعد نئی سج دھج میں نہایت خوبصورت وخوشنما ایک اور نام "ذکر رسول" کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، پرانے اڈیشن کے مضامین مولانا کے جریدہ "سچ" سے منقول تھے، نئے اڈیشن میں طبع اول کے

چار مضامین جو براہ راست سیرت کے موضوع پر نہ تھے، حذف کر دیئے گئے ہیں، اور ان کے بجائے چار ریڈیائی تقریریں "صدق جدید" سے شامل کی گئی ہیں، یہ مجموعہ کل سترہ مضامین پر مشتمل ہے، ان مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا کی بھیانک حالت، عربوں کی ضلالت وگمراہی، راہ حق میں آپ کی صعوبتوں، آپ کی یتیمی، عسرت وفقر اور آپ کی تعلیم وہدایت کے انقلاب انگیز اثر سے دنیا کی کایا پلٹ ہونے کا ذکر ہے، مصنف نے آپ کی عظمت وبرتری، کامیابی وکامرانی اور آپ کے مخالفین کی ذلت ورسوائی اور ہلاکت وتباہی بھی دکھائی ہے، اور نوع انسانی پر آپ کے احسانات، یتیموں کی سرپرستی اور غریبوں اور مجبوروں سے ہمدردی ومواسات کا تذکرہ بھی کیا ہے، بعض مضامین استفسارات کے جواب میں لکھے گئے تھے، "حبیب ومحبوب" اسی نوعیت کا مضمون ہے جو دراصل سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی نرالی تفسیر ہے، ایک اور مضمون "ورفعنا لک ذکرک" کی تفسیر ہے، اس میں ذکر رسول کی بلندی اور آپ کے آوازۂ شہرت کے بعض پہلوؤں کا عجیب ودلچسپ انداز میں ذکر ہے، ایک مضمون میں سیرت نبوی کو مستشرقین کے تلبیسات وتحریفات کا ہدف بنانے کا ذکر ہے، اس طرح یہ مجموعہ خلق محمدی کا جوہر اور اسوۂ رسول کا عطر ہے، جس میں مولانا کے جادو نگار قلم اور ان کی انشا کے بانکپن نے چار چاند لگا دیا ہے، شروع میں مولانا کی کیف واثر میں ڈوبی ہوئی نعت نور علیٰ نور کی مصداق ہے، مولانا کی تحریروں کے عاشق اور ان کے ادب وانشا کے شیدائی جناب منظور علی صاحب لکھنوی نے اسے معنوی حیثیت سے اس قدر دلکش شائع کرکے اپنے عمدہ سلیقہ اور نہایت خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

فیضان محبت:- مرتبہ مولانا قمر الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گردپوش، قیمت تیئیس روپیے، پتہ مکتبہ دارالمعارف ۲۰۴، بخشی بازار، الہ آباد۔

مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کی ذات علم وعمل اور شریعت وطریقت کی جامع اور

(۹)

درکفے جام شریعت، درکفے سندانِ عشق کا نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں شعر و سخن کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے، اس کے پردہ میں وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہیں، اس لئے ان کی شاعری ان کے قلبی واردات و باطنی کیفیات کا مرقع، حقیقت و معرفت کے رازہائے سربستہ کی ترجمان، عشق و محبت کے حقائق سے معمور اور جنون و مستی کے جذبات سے لبریز ہوتی ہے، دراصل یہ ساز لاہوتی اور ترنم ربانی طالبین و سالکین کے لیے ایک ایسا دستور عمل ہے، جس میں سلوک و عرفان کے ہر مرحلہ کے آثار و نشانات موجود ہیں، اس لئے اس کی شرح و تفسیر کی ضرورت تھی، مگر ذوقی و وجدانی حقائق اور ان کے اسرار و کیفیات کی شرح و تفسیر آسان نہیں، مولانا قمر الزماں صاحب اس کوچہ کے ماہر ہیں، ان کی توجہ و محنت نے "عرفان محبت" کو فیضان محبت کی صورت دیکر جلوہ گاہ عام کر دیا ہے، انھوں نے مولانا کے منتخب عارفانہ کلام کو مختلف عنوانات کے تحت درج کرکے ان کی دلنشیں تشریح کی ہے اور جابجا مزید وضاحت کیلئے دوسرے عارفین خصوصاً "نکتہ دانِ روم" کے اشعار بھی پیش کئے ہیں جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت: مرتبہ جناب اکمل یزدانی جامعی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۴، قیمت۔ دس روپے، پتہ (۱) جنرل پرنٹنگ پریس، لائن کشن گنج، پورنیہ۔ بہار (۲) سلیمان لائبریری، بہادر گنج، پورنیہ۔ بہار (۳) محمد فرید بک سیلر کانکی مغربی دیناج پور، بنگال۔

پورنیہ صوبہ بہار کا قدیم ضلع ہے جو پہلے طول و عرض کے لحاظ سے موجودہ ضلع سے کافی بڑا تھا، خلجیوں کے زمانہ میں یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور مغلوں کے دور میں یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی، سترہویں صدی عیسوی کے آخر سے یہاں کے حکام فوجدار کہلاتے تھے جو برائے نام صوبہ داران بنگال کے ماتحت ہوتے تھے، ان کی حکومت انگریزوں کے دور حکومت سے پہلے تک رہی، اس کتاب میں پورنیہ کے انہی فوجداروں کے دور کا حال بیان کیا گیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں فوجداروں کے مختصر حالات، سیاسی خدمات اور فوجی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، اور دوسرے باب میں محلات اور مضافات کے اعتبار سے پورنیہ کی تقسیم کا ذکر کرنے کے بعد اس کی مشہور مسجدوں، مندروں، مقبروں، اہم عمارتوں، سڑکوں اور پلوں وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر مرکزی مقامات اور معروف بازاروں کا ذکر ہے، ایک حصہ میں پورنیہ کی آمدنی، مالگذاری، زرعی پیداوار اور اس زمانہ کی مشہور صنعتوں کا ذکر ہے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقوں کے مردوں اور عورتوں کے لباس اور پوشاک کا تذکرہ ہے، اسی باب میں فوجداروں کی علم و ادب نوازی کے ضمن میں پورنیہ میں فارسی و اردو کے رواج، دونوں زبانوں کی کچھ تصنیفات و مخطوطات اور اہم شعراء کا ذکر بھی آگیا ہے، آخر میں فوجداروں کے غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ کتاب محنت سے لکھی گئی اور مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۶ء عدد ۵

مضامین

مقالات

بَابُ التقریظ والانتقاد